Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1966

سچّے موتی

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہؐ کے ساتھ سفر میں تھے۔ بعض نے ہم میں سے روزہ رکھا اور بعض نے نہیں رکھا۔ ہم ایک دن ایک منزل میں اترے۔ جن لوگوں نے روزہ رکھا تھا وہ ضعف سے نڈھال ہو کر آرام کرنے لگے۔ اور جن لوگوں نے روزہ نہیں رکھا تھا وہ اپنے کاموں میں مصروف رہے۔ چنانچہ انہوں نے خیمے کھڑے کئے اور اونٹوں کو پانی پلایا۔ رسول اللہؐ نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ آج وہ لوگ جنہوں نے روزہ نہیں رکھا تھا، سارا ثواب لے گئے۔

(بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں

کس طرح مرتب ہوئیں۔ کن کن مراحل سے گذریں۔ اور آج ان کی حالت کیا ہے

توراۃ

انجیل

وید شاستر

رامائن

مہابھارت

بدھ مت

قرآن مجید

جین مت

مجوسیت

شنٹو ازم

طاؤ ازم

قیمت قسم اعلیٰ مجلد : پانچ روپے

چیپ ایڈیشن : تین روپے

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

بدل اشتراک

سالانہ — پاکستان — دس روپے

سالانہ — ہندوستان — پندرہ روپے

سالانہ — غیر ممالک — ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان — ایک روپیہ

ہندوستان — ڈیڑھ روپیہ

جلد ۱۹

دسمبر ۱۹۶۶ء

نمبر ۱۲

فہرست مضامین

۱۔ لمعات — ۲

۲۔ چین کا عالمی کردار (خورشید عالم صاحب) — ۱۴

۳۔ روزے کے قرآنی احکام — ۲۱

۴۔ حقائق و عبر — (ہندوستان کے مسلمان) (ہندا صلی ریتہ میں) (قلت خوراک کا خطرہ) (ہماری تاریخ) (آسمانی آبادیاں) (احکام شریعت میں تبدیلیاں) (رمضان کے زمانے) — ۳۵

۵۔ نقد و نظر — (کتاب اسلامیات برائے سیکنڈری کلاسز) — ۴۰

۶۔ مفسدین کا انجام — (پرویز صاحب) — ۴۶

۷۔ نبی اور رسول — (حسن عباس رضوی صاحب و مولانا محمد فضل قدیر ندوی صاحب) — ۵۷

۸۔ زنا کی سزا — رجم — (اسلامی مشاورتی کونسل کی سفارش) — ۷۷ — ۸۰

ایڈیٹر عبد الطیبی، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵- بی گلبرگ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف، مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اِنَّ ھٰذِہٖ تَذْکِرَۃٌ

تو اگر بھول گیا ہو تو بتا دوں تجھ کو!

۲۵ر دسمبر کا دن ہمارے ہاں بطور ایک قومی تقریب کے منایا جاتا ہے۔ اسے اس طرح منایا بھی جانا چاہیئے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس شوکت و عظمت سے پاکستان سے متعلق تقاریب کو منایا جانا چاہیئے، ہم انہیں اس انداز سے منا ہی نہیں رہے اور یہ اس لئے ہے کہ ان تقاریب کی اہمیت ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہے، اور یہ قوم کی سب سے بڑی بدنصیبی اور پاکستان کا بہت بڑا المیہ ہے۔ اس عدم احساس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کا اوپر کا طبقہ دن رات اسی دُھن میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ لی جائے۔ اس لئے اسے فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ ملی اور اجتماعی مسائل کے متعلق کچھ سوچ سکے۔ اور قوم کا نچلا طبقہ فکرِ معاش کی کشمکش سے اس قدر پریشان ہے کہ اُسے کسی اور طرف دھیان دینے کا ہوش ہی نہیں ——— ۲۵ر دسمبر قوم کے عظیم محسن، قائداعظم محمد علی جناح (علیہ الرحمتہ) کا یومِ پیدائش ہے۔ کسی شخص کے یومِ پیدائش یا یومِ وفات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ یہ دراصل بہانہ ہوتے ہیں اس شخص کے ان کارناموں کی یاد تازہ رکھنے کا جن کی وجہ سے وہ قوم کا محسن قرار پاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں حصولِ پاکستان سے بڑھ کر عظیم کارنامہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا، اس بطلِ جلیل سے بڑا جس کے ہاتھوں یہ کارنامہ سرزد ہوا، قوم کا محسن اور کون قرار پا سکتا ہے۔

لیکن ہماری بدبختی یہی نہیں کہ ہم اس عظیم واقعہ کی اہمیت کو آہستہ آہستہ فراموش کرتے جارہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر حرماں نصیبی یہ ہے کہ ہم خود اس مقصد و مدعا کو نظر انداز کرتے جارہے ہیں جسکے حصول کا پاکستان ذریعہ تھا۔ ہم نے پاکستان کو ایک ایسا خطۂ زمین سمجھ لیا ہے جو ہمیں بطور جاگیر مل گیا ہے۔ حالانکہ نہ یہ محض ایک خطۂ زمین ہے کہ جیسے ہم جس طرح ہمارے جی میں آئے اپنے مصرف میں لائیں اور نہ ہی ایک موروثی جاگیر ہے جس کی مفت کی آمدنی پر ہم گلچھرے اڑائیں۔ یہ ایک نہایت بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ قائداعظمؒ کی یاد منانے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ہم اس مقصد کو سامنے لائیں جس کے لئے انہوں نے اس خطۂ زمین کو حاصل کر کے، ہمیں اس کا وارث بنایا تھا۔ حصولِ پاکستان سے مقصد کیا تھا، اسے قائداعظمؒ نے مستور یا مبہم نہیں رکھا تھا کہ ہم متعین طور پر اس کی نشاندہی نہ کر سکیں۔ اسلئے انہوں نے نہایت واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا تھا ـــــ اور ایک آدھ بار ہی نہیں، بلکہ وہ تحریکِ پاکستان کے دوران اسے بار بار دہراتے اور ببانگِ دہل اس کا اعلان کرتے رہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ انہوں نے اس مقصد و مدعا کو کن الفاظ میں بیان کیا تھا ـــــ یہ حقائق اس سے پہلے بھی طلوعِ اسلام کے صفحات پر متعدد بار پیش کئے جاچکے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ انہیں بار بار دہراتے رہنے کی اشد ضرورت ہے، بالخصوص جبکہ یہ حقیقتیں قوم کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی جارہی ہیں۔

پاکستان کا تصور، ایک متعین شکل میں، سب سے پہلے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا۔ چنانچہ انہوں نے مسلم لیگ (۱۹۳۰ء) کے خطبۂ صدارت میں، اس کا بنیادی مقصد ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

> ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسوؔ کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان ـــ جمادات اور نباتات کی طرح ـــ بالکل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے، بلکہ وہ ایک ایسی بلند و بالا ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص

معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فِٹ ہو۔ (اور یہ چیز اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔) اسی لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملاکر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کی جائے۔

ہمارے ہاں کے اُس وقت کے نیشنلسٹ علماء جن کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے، ان کے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کی آزادی کا تصور وہی تھا جس کے بارے میں اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان سمجھتا ہے مسلمان ہے آزاد!

چنانچہ مولانا مدنی (مرحوم) کے ایک اخباری بیان کا جواب دیتے ہوئے علامہ اقبالؒ، مرحوم نے کہا تھا کہ:۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریزی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے میں کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہوسکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو، کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے، تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہوں۔

یہ تھا مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کا وہ اصولی تصوّر جسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا۔ قائداعظمؒ نے اسی اصول کو ایک زندہ حقیقت بنانے کے لئے تحریکِ پاکستان شروع کی۔ اور اس میدان میں قدم قدم پر اس کا اعلان کرتے چلے گئے کہ اس تحریک کا مقصد اور حصولِ پاکستان کا مطلوب کیا ہے۔ مثلاً انہوں نے ۱۹۴۵ء میں، فرنٹیر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے ایک پیغام میں فرمایا۔

پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری۔ ہم نے صرف اپنی

آزادی حاصل نہیں کرنی ہے ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت بھی کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

۲۷ رنومبر ۱۹۴۰ء کو ایڈورڈس کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے الگ الگ نظریۂ زندگی کی وضاحت فرمائی، بلکہ اس طرح دین اور مذہب کے فرق کو بھی نمایاں کر کے رکھدیا۔ انہوں نے فرمایا:۔

ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں، ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس لاہور ۱۹۴۰ء میں، جہاں پاکستان کی قرارداد منظور ہوئی تھی تقریر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں، بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے! ہندو اور مسلمان، مذہب کے ہر معاملے میں جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے، یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جنکی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ سلطنت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

ان تصریحات کے ساتھ لاہور کے تاریخی اجلاس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے دس کروڑ مسلمانوں نے اُسے اپنے ملی نصب العین اور تقاضائے دین و ایمان کی حیثیت سے نہ صرف قبول کر لیا، بلکہ اس کے لئے آخری خندق تک لڑ مرنے کے لئے کارزار سیاست میں نکل آئے۔

اس قرارداد کو قومی نصب العین کی صورت اختیار کئے ابھی ڈیڑھ سال نہیں گزرا تھا، کہ اگست ۱۹۴۱ء میں قائداعظمؒ حیدرآباد تشریف لے گئے۔ اور وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء نے بھی ان سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران میں طلباء نے قائداعظمؒ سے بڑے اہم اور بنیادی سوالات کئے

جن کے جوابات قائدِ اعظمؒ نے ایسے متعین، دو ٹوک اور نکھرے ہوئے انداز میں دیئے کہ مملکت پاکستان کے حصول کا منشار و مقصود پوری طرح واضح ہو کر سامنے آگیا۔ اور نیٹ پریس کے نمائندے نے اس ملاقات کی جو رپورٹ مرتب کی اس کے ضروری حصے سوالات و جوابات کی صورت میں بعینہٖ درج ذیل ہیں۔

سوال:- مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:- "جب میں انگریزی میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اُس زبان اور محاورے کے مطابق (لامحالہ) میرا ذہن، خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک، مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوےٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآنِ مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا رُوحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔ قرآنِ کریم کی اصولی ہدایات اور طریقِ کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہے بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک، اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔"

سوال:- اس سلسلے میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:- اشتراکیت، بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک، درحقیقت اسلام اور اُس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزار کا ساربط اور تناسب نہیں پایا جاتا۔"

اس کے بعد وہ تیسرا سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمایئے، جو ہمارے نزدیک اس موضوع پر مقطع کا بند ہے۔ غور سے سنیئے:-

سوال:- اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟

جواب:- اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ، قرآن مجید کے احکام، اور

اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی، قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت' دوسرے الفاظ' میں قرآنی اصول' اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے' آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔"

آپ اس جواب کے ایک ایک فقرہ پر غور کیجئے۔ اور دیکھئے کہ اس حقیقت کو کس قدر غیر مبہم، مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ کوئی مملکت اسلامی کس طرح بنتی ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اختیار کی جائے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ اس کے سوا کسی اور کا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا کسی اور کو اس کا حق ہی حاصل نہیں کہ کسی سے اپنا فیصلہ اور حکم منوائے۔

لیکن خدا تو ایک ان دیکھی، مطلق ذات کا نام ہے۔ اس کی اطاعت کی عملی شکل کیا ہوگی؟ کیسے معلوم کیا جائے کہ فلاں معاملہ میں اس کا حکم اور فیصلہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "اس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں"۔ اسی لئے اس کا ارشاد ہے کہ ــ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ ۔ (۷/۳) جو کچھ تمہاری طرف خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو' اس کے سوا کسی اور سرپرست کا اتباع مت کرو"۔ ــ بالفاظِ دیگر ـ "اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے"۔ "اسی کے احکام ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ یہی چیز کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز قرار پاتی ہے ـــ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴) جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتا، تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔

قائداعظمؒ کی اس دوٹوک وضاحت سے مملکتِ پاکستان کا بنیادی دستور اُبھر کر سامنے آجاتا ہے اور اس میں کسی ادنیٰ شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ان کے نزدیک مملکتِ پاکستان کے آئین و قوانین کی اساس قرآنِ کریم کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتی۔ اسی کتاب کو ہمارے قوانین کا سرچشمہ اور احکام کا ماخذ قرار پانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ہمارے نظامِ مملکت کے لئے کوئی دوسرا ماخذ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ کریم کی عظمت اور جامعیت ان کے دل و دماغ پر کس درجہ منقوش تھی۔ اس کا اندازہ ان کے اکثر بیانات سے سامنے آتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں عید کی تقریب سعید پر قوم کے نام اپنے پیغام میں انہوں نے فرمایا۔

اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبن نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ "بحر اطلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے جس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوع انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور وہ قوانین منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔"

اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق ہے جو مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا — ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔

یہ تھی قرآن کریم کی عظمت اور جامعیت جس پر قائداعظم کا ایمان تھا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوتے تھے۔ ان کی الگ پارٹیاں بھی تھیں۔ ان میں نسل اور صوبائی تعصب بھی موجود تھا۔ خود پاکستان کو جن دو بڑے بڑے خطوں پر مشتمل ہونا تھا، یعنی مغربی اور مشرقی پاکستان میں ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ لسانی اور نسلی نقطۂ نگاہ سے بھی ان دونوں خطوں کے رہنے والوں کے درمیان کوئی وجہِ اشتراک نہ تھی۔ سوال یہ تھا کہ ان تمام وجوہِ اختلاف کے باوجود، وہ کون سی قدرِ مشترک تھی جو ان باہمدگر متضاد عناصر کو ایک نقطہ پر جمع کر سکتی تھی۔ اس کا جواب قائداعظمؒ کے الفاظ میں سنیئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (۱۹۴۳ء۔ واقع کراچی) میں پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ

وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ۔

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر — خدا کی کتاب عظیم قرآن کریم ہے۔

مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔

ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب، ایک امت!

ہم اس سلسلہ میں، قائداعظمؒ کی تقاریر اور بیانات سے، اسی قسم کے اور بھی بہت سے اقتباسات پیش کر سکتے تھے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ مقصد پیشِ نظر کے لئے یہی اقتباسات کافی ہیں۔ انہوں نے یہ کچھ حصولِ پاکستان سے پہلے کہا تھا۔ کچھ عرصہ سے بعض گوشوں سے یہ آواز بلند کی جا رہی ہے کہ قائداعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کے دوران تو بے شک یہی کہا تھا لیکن حصولِ پاکستان کے بعد انہوں نے اس موقف میں تبدیلی کر لی تھی۔ — اس قسم کی آوازیں، ایک خاص مقصد کے ماتحت، خاص سازش کے طور پر بلند کی یا کرائی جاتی ہیں۔ ورنہ جو شخص قائداعظمؒ کی سیرت و کردار سے ذرا سی بھی واقفیت رکھتا ہے، وہ بلا ادنیٰ توقف کہہ دے گا کہ اس قسم کی دو عملی قائداعظمؒ کی فطرت کے خلاف تھی۔ وہ ایسا اصول پرست انسان تھا کہ اس نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ دل میں کوئی اور بات رکھیں اور بطور حکمتِ عملی، زبان سے کچھ اور کہدیں۔ یا مقصد کوئی اور ہو اور اس کے حصول کے لئے ذرائع کوئی اور اختیار کئے جائیں۔ وہ اس قسم کی منافقانہ سیاست سے کوسوں دور تھے۔ جو کچھ وہ تحریکِ پاکستان کے دوران کہتے تھے، اس پر ان کا پورا پورا ایمان تھا۔ اور اسی کو وہ حصولِ پاکستان کے بعد دہراتے رہے۔ چنانچہ انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے دو ہی ماہ بعد، اکتوبر ۱۹۴۷ء میں خالق دینا ہال (کراچی) میں، حکومت کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

> پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں۔ اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔

"اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول" کیا ہیں؟ — اس کی تشریح ذرا آگے چل کر آئے گی۔ اس مقام پر ہم صرف

اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ جن اسلامی اصولوں کا اعلان، قائداعظمؒ تحریک پاکستان کے دوران میں کیا کرتے تھے، انہی کا اعادہ وہ حصولِ پاکستان کے بعد بھی کرتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوؤں نے جس قدر مسلمانوں کا کشت وخون کیا وہ تاریخ کی نہایت عبرت انگیز خونی داستان ہے۔ اس وقت حالات بڑے نازک تھے جن کی وجہ سے مسلمان بہت مضطرب و پریشان تھے۔ ان حالات میں قائداعظمؒ نے ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یونیورسٹی سٹیڈیم (لاہور) میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"اگر ہم نے ان حالات میں قرآن سے راہنمائی لی تو ہم ہندوؤں کی سازش کے علی الرغم کامیاب ہو کر رہیں گے۔"

وہ ایسے ناساعد حالات میں بھی قرآن ہی سے راہنمائی حاصل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے اہم مسئلہ دستورِ پاکستان کی تدوین کا تھا۔ ساری دنیا کی نظریں پاکستان کی طرف اٹھ رہی تھیں ـــــ یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ نوزائیدہ مملکت جو اسلام کے ازسرِنو احیاء کا دعوےٰ لے کر وجود میں آئی ہے، اپنے لئے دستور کس انداز کا مرتب کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں قائداعظمؒ نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کیا جس میں کہا کہ۔

پاکستان کا نسٹی ٹیوشنٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیسی ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ بردار جمہوری انداز کا آئین ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت، اور ہر ایک کے ساتھ عدل اور دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئین پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ مسلمات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) "خدائی مشن" کو پورا کریں۔

یہ قوم کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ قائداعظمؒ کی عمر نے ایفا نہ کیا اور انہیں اتنی مہلت نہ مل سکی کہ وہ دستورِ پاکستان کو مرتب کر سکتے۔ ورنہ اگر یہاں کا دستور ان کی زندگی میں مرتب ہو جاتا تو اس وقت تک یہ ملک اسلامی اقدار کے نقطۂ نگاہ سے کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوتا۔

اب اسلام کے عدلِ عمرانی کے ان اصولوں کو دیکھئے جنہیں عمل میں لانے کے لئے پاکستان حاصل

کیا گیا تھا۔ اسلام کا منتہیٰ یہ ہے کہ ایک فرد کی تمام مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اس طرح ہو جائے کہ وہ اِس دنیا میں اور اس کے بعد حیاتِ اُخروی میں، زندگی کے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے اس مقصد کے لئے وہ سب سے پہلے افراد کو، زندگی کی بنیادی ضروریات (خوراک، لباس، مکان وغیرہ) کی طرف سے بے فکر کر دیتا ہے، تاکہ وہ اطمینان سے، بلند مقاصدِ انسانیت کے حصول کے لئے جدوجہد کر سکیں اس کے لئے اسلامی نظامِ مملکت، تمام افرادِ مملکت کو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ "ہم، خدا کی طرف سے تمہاری اور تمہاری اولاد کی ضروریاتِ زندگی کا ذمہ لیتے ہیں"۔ اس کا نام اسلام کا عدلِ عمرانی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۷ء میں قائداعظمؒ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ

> سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہے۔ لیگ کا مستقبل اس سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضر کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔ اگر ہندوؤں نے سوشل ڈیماکریسی کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے نہ ٹکرائے، اسلام میں کسی تبدیلی کے مترادف نہیں ہوگا۔ بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا کہ یہ شروع میں تھا۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد جب مملکت نے اپنا (سٹیٹ) بنک کھولا تو، جولائی ۱۹۴۸ء میں اس کے افتتاح کی تقریب قائداعظمؒ کے ہاتھوں سرانجام پائی تھی۔ اس موقعہ پر انہوں نے جو تقریر فرمائی (اور غالباً یہ ان کی زندگی کی آخری تقریر تھی) اس میں کہا کہ۔

> ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں، اس مقصد کا حصول، مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے، جو انسانی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو صرف یہی

وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برآ ہوسکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عاید ہوتا ہے، اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچا لے گا، اور نوعِ انسان کی بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔

لیکن ظاہر ہے کہ جاگیرداری، زمینداری اور سرمایہ داری کی موجودگی میں، اسلام کا یہ معاشی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، ملک کے بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار مسلم لیگ کے ساتھ تھے لیکن قائداعظمؒ انہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے تھے، کہ حصولِ پاکستان کے بعد ان کی پوزیشن کیا ہو گی۔ انہوں نے تشکیلِ پاکستان سے بہت پہلے ۱۹۴۳ء میں، آل انڈیا مسلم لیگ کے دہلی کے سیشن میں برملا اعلان کیا کہ

> اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں، وہ ایک ایسے فتنہ انگیز، ابلیسی نظام کی رُو سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں، خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔۔۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔۔۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہو گا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

یہ تھا مختصر الفاظ میں وہ مقصد جس کے لئے قائداعظمؒ نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا اور جسے حاصل کر کے ہمیں اس کا وارث بنایا تھا۔ یعنی

(۱) ایک ایسی مملکت کا حصول، جس میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود قرآن کریم کی رو سے متعین ہوں۔

(۲) جس میں کوئی قانون ایسا نہ ہو جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔

(۳) جس میں تھیاکریسی، یعنی مذہبی پیشواؤں کی اجارہ داری کا کوئی سوال نہ ہو۔

(۴) جس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔

(۵) جس میں سرمایہ داری اور زمینداری کے غیر اسلامی نظام کو ختم کر دیا جائے۔

(۶) جس میں نہ مغرب کی بے لگام جمہوریت راہ پا سکے، نہ مارکس کی خدا فراموش اشتراکیت۔

(۷) جس میں نظامِ سیاست و معیشت بہرحال حدود اللہ کے تابع رہے۔

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے قائداعظمؒ نے پاکستان کے لئے انگریز، ہندو اور خود مسلمانوں کے علمائے کرام کے خلاف چومکھی لڑائی لڑی تھی۔ ہماری بدبختی یہی نہیں کہ ہم اس وقت تک، پاکستان کو ان تصورات کے مطابق متشکل نہیں کر سکے، اس سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ خود یہ تصورات ہی رفتہ رفتہ قوم کی نظروں سے اوجھل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ابھی یہاں وہاں، ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں عملی حصہ لیا جنھیں قائداعظمؒ کے ساتھ کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جنھوں نے، ان کے ان ارشادات و پیغامات کو اپنے کانوں سے سنا اور اپنی آنکھوں سے پڑھا۔ لیکن یہ لوگ آہستہ آہستہ اٹھتے چلے جائیں گے۔ ان کے بعد ہماری آنے والی نسلوں کو اتنا بتانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا کہ پاکستان کیوں مانگا گیا تھا اور اس سے مقصود و مفہوم کیا تھا؟ کس قدر سنگین ہے ہمارا یہ جرم کہ ہم نے آج تک نہ تحریکِ پاکستان کی کوئی ایسی مستند تاریخ مرتب کی ہے جس میں یہ مقاصد ابھر کر سامنے آ جائیں اور نہ ہی قائداعظمؒ کی کوئی ایسی سوانح عمری مدون کی ہے جو ان کے ان تصورات کی آئینہ دار ہو۔

قائداعظمؒ کے یومِ پیدائش کی تقریب پر کئی ایک اجتماعات منعقد ہوں گے اور رہنمایانِ ملت کی طرف سے بہت سے پیغامات نشر کئے جائیں گے لیکن (جیسا کہ ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں) ہمارے خیال میں اس تقریب کے منانے کی اس سے بہتر شکل اور کوئی نہیں کہ قائداعظمؒ نے جن مقاصد کے حصول کے لئے پاکستان کی مملکت کو ایک ذریعہ بنایا تھا، ان مقاصد کا عام چرچا کیا جائے اور اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں سامنے لایا جائے کہ قائداعظمؒ کی حقیقی یادگار، اس نقشے کے مطابق پاکستان کو متشکل کرنا ہے جو نقشہ انہوں نے مرتب کر کے دیا تھا، اور وہی نقشہ اس مملکت کو صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنا سکتا ہے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم دنیا کی نظروں میں کس قدر ناخلف قرار پائیں گے اور خدا کی نگاہوں میں کس قدر ناسپاس گزار اور قرآن کریم کی یہ تنقید ہم پر کس طرح صحیح طور پر صادق آئے گی کہ

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ

يَلْقَوْنَ غَيًّا۔ (۱۹/۵۹)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوتے جنہوں نے اپنے فرائضِ منصبی کو فراموش کر دیا

اور اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے پڑ گئے۔ اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

خورشید عالم

"چین" کا عالمی کردار (۱)

تاریخ اور تہذیب کے اعتبار سے چین ایک پرانا اور منفرد ملک ہے۔ یہ فیصلہ ابھی تک نہیں ہو پایا کہ انسان اور تہذیب انسانی کا اولین گہوارہ کوئی ایک ہے تو کون سا ہے۔ جانے انسان کو کب تک یہ جاننے کے لئے سر پٹخنا پڑے گا کہ اس کا دورِ تہذیب کب اور کرۂ ارض کے کس گوشے سے شروع ہوا۔ علمائے تاریخ و حفریات نے کبھی دجلہ اور فرات کے کناروں کو اولیت کا شرف بخشا اور کبھی نیل میں جھانک کے تہذیب کے ہیولے کا عکس دیکھنے کی سعی کی۔ اب ان کا دامنِ توجہ سندھ کی طرف کھنچ رہا ہے اور اس کی تہذیب کی قدامت کی ڈور کا سرا ڈھونڈنے سے بھی انہیں مل نہیں رہا۔ چین ایک ایسا ملک ہے جسے تہذیب کا اولین گہوارہ نہ بھی تسلیم کیا جائے تو اسے اولیت کے امیدواروں میں سرِفہرست رکھے بغیر چارہ نہیں۔

چین کا امتیاز یہی نہیں کہ وہ مسلّمہ طور پر بہت پرانا ہے۔ وہ اپنے طور پر منفرد بھی ہے۔ وسطی ایشیا سے انسانوں کا لاوا زمانۂ قدیم سے پھوٹتا اور پھیلتا رہا۔ اس سے دنیا کی معلوم تہذیبوں میں نت نئی حرکت و حرارت کا اضافہ ہوتا رہا۔ یہ لاوا سیلاب کی طرح جنوب کی طرف بہتا رہا۔ مغربی پاکستان اس کی تیز لہروں کی زد میں ہی نہیں رہا، ان کی آماجگاہ بھی بنا رہا۔ جو لاوا جنوب کی طرف نہ بہ سکا، وہ چین میں جمع ہو کر تہذیب و تمدن کی ایک نئی فصل کے لئے زمین اور سامانِ نشوونما تیار کرتا رہا۔ شمال کے منطقۂ منجمد، مشرق کے بے پایاں سمندر اور جنوب کے بلند ترین سلسلۂ کوہ نے چین کو مخصوص فضا میں پرورش پانے کا عمدہ موقع مہیا کئے رکھا۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ قدرتی عوامل نے چین کو دنیا سے الگ تھلگ کئے بغیر اس کے جداگانہ طور پر آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی راہ ہموار کی۔ بیرونی دنیا سے چین کے روابط ہمیشہ قائم رہے اور یہ محض تاریخی اتفاق نہیں کہ باہر کی دنیا سے روابط قائم رکھنے میں پاکستان کے دونوں بازوؤں نے اہم کردار ادا کیا۔ مشرقی پاکستان سے چین کا تعلق تبت کے راستے رہا اور مغربی پاکستان سے سنکیانگ اور کشمیر کے راستے۔ انہی راہوں سے تہذیب انسانی کے ان دو اہم اور

قدیم مراکز میں انسانی آمد و رفت، تجارتی لین دین اور خیالات و معتقدات کے تبادلے کا سلسلہ چلتا رہا۔ چین اور پاکستان کا یہ تعلق تاریخ اور جغرافیہ کے عناصر کا قدرتی نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں ممالک کے اپنے آپ میں آجانے سے یہ رشتہ استوار تر ہو گیا ہے۔ اس رشتے کی اساس اس قدر محکم ہے کہ اس سے انکار وہ اندھا ہی کر سکتا ہے جس کی آنکھ تاریخ کی روشنی سے منور نہیں۔

ہزاروں سال کی طویل تاریخ میں چین نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے، لیکن اس کا تشخص برقرار رہا۔ ایک کمتر تہذیب اس ضربِ پیہم سے کبھی زندہ نہ بچ سکتی۔ چین علم و دانش کے لئے مشہور رہا اور دنیا سے حکمت و بینش سیکھتا بھی رہا، اور اسے سکھاتا بھی رہا۔ فنون و معرفت میں اس کی ترقی دنیا بھر سے خراجِ تحسین حاصل کرتی رہی۔ جب اقوامِ مغرب مشینوں کے زور پر دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ کر سیاسی غلبہ حاصل کرنے لگیں تو چین بھی ان کا شکار بنتا نظر آیا۔ یہ چین کی تاریخ اور اس کے خصوصی مزاج کا کرشمہ ہے کہ استعمارِ فرنگ اس کے دروازے پر دستک تو دے سکا لیکن تمام کوششوں کے باوجود اندر داخل ہو کر اس گھر پر قابض نہیں ہو سکا۔ یورپی اقوام اپنا سامانِ تجارت لے کر چین پہنچیں تو انہوں نے دیکھا کہ یہ گھر اس قدر بھرا ہوا ہے کہ اس میں ان کے مال کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ انہیں البتہ ایک جنس کی کمی نظر آئی اور وہ تھی افیون۔ انہوں نے افیون کو زبردستی چینیوں کے حلق میں ٹھونسنا چاہا، اور جب وہ اسے نگلنے پر تیار نہ ہوئے تو ان کے خلاف جنگ کا وہ سلسلہ شروع کیا جو "جنگِ افیون" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جو کئی سال تک جاری رہا۔ برطانیہ نے ہمالیہ کے جنوب میں پورے برصغیر پر تسلط قائم کر لیا تو اس نے چین اور پاکستان کے درمیان ہزاروں سالوں سے چلنے والے راستوں کے ذریعے چین کے خلاف طرح طرح کی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ ان ریشہ دوانیوں کا مرکز دہلی تھا جو آج اس سازش کا کہیں زیادہ سرگرم مرکز بن گیا ہے۔ کیونکہ پہلے سازش کرنے والے انگریز تھے اور اب یہ ذمہ داری ان سے کہیں بڑی طاقت یعنی امریکہ نے سنبھال لی ہے اور "آزاد" بھارت نے اپنے آپ کو اس کا پوری طرح آلۂ کار بنا لیا ہے۔

یورپ نہ سمندر کے کھلے راستوں سے چین میں داخل ہو سکا اور نہ ہمالیہ کے چور دروازوں سے۔ اس ناکامی نے اس کے دل میں چین کے خلاف نفرت ہی نفرت بھر دی۔ امریکہ یورپ کی اس روایتی نفرت کا وارث ہے۔ انیسویں صدی میں یورپ نے چین میں جو زک اٹھائی، اس کی تلافی کے لئے اسے ایک موقعہ موجودہ صدی میں ملتا دکھائی دیا تو یورپ نے اپنی خفت کا ٹیکہ دھونے کی بھرپور کوشش کی۔ بیسویں صدی میں چین میں انقلابات آئے تو ایسی شخصیتیں ابھر کر سامنے آئیں جن کی تعلیم فرنگی درسگاہوں بالخصوص امریکہ میں ہوئی تھی۔ امریکہ کو بھروسہ تھا کہ اس کی تعلیم سے سیراب ہونے والے چینی ذہن اس کے اثر و نفوذ کا آسان ذریعہ بن

جائیں گے۔ چنانچہ سیاست اور معیشت کے اجنبی اصولوں اور مردود حیلوں کو لے کے وہ دوستی کے لباس میں دیارِ چین میں آ دھمکا۔ اسے توقع تھی کہ چین کے نظامِ سیاسی پر امریکہ کی چھاپ لگ جائے گی اور غریبی اور پسماندگی کی شکار یہ عجیب و غریب قوم اس کی دست نگر ہو کے رہ جائے گی۔ چین کی مٹی نے اس بیج کو قبول نہیں کیا۔ الٹا اسے بونے اور پروان چڑھانے کی جملہ کوششیں رنگ لائیں تو امریکہ اشتراکی انقلاب کے اس شجرِ ممنوعہ کو دیکھ کے بوکھلا گیا جو تینتیس سال پہلے روس میں برگ و بار لایا تھا اور جس کی تلخی سے اس کے کام و دہن ابھی تک نجات حاصل نہیں کر سکے تھے۔ اس کے دماغ سے اس سودائے نفرت کو نکالنے کے لئے تاریخ کسی چنگیز کے انتخاب میں لگی ہوئی ہے۔

چین کا اشتراکی انقلاب اس کے مزاجِ خصوصی کا قابلِ فہم مظاہرہ ہے۔ اس انقلاب کا فوری محرک وہ عالمی قوتیں تھیں جو ہجوم کر کے چین میں وارد ہو گئی تھیں۔ امریکہ آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر چین میں اپنا اثر دخل بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ روس جوابِ آں غزل کے طور پر امریکہ کا راستہ روکنے کے لئے چین تک پہنچ گیا۔ جاپان بھی سیاست اور تجارت کے گھوڑوں پر سوار غلبہ حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ اس نے تو باقاعدہ جنگ کی طرح ڈال دی اور چین کے کئی علاقوں پر غاصبانہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان قوتوں کا ہجوم روحِ چین کے لئے عجیب ابتلا تھا۔ امریکہ کا نظامِ سرمایہ داری چین کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے پرانے نظام میں مشترکہ خاندان کا سا رنگ جھلکتا تھا۔ ایک خاندان میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کا چلن کیسے ہو سکتا تھا؟ جاپان کی پٹاری میں سیاسی اور معاشی استحصال کے ناگ تھے جنہیں چین دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ صرف روس کے اشتراکی تصور اور فلسفے میں چین کو اپنے مزاج کی تسکین کے آثار نظر آئے۔ چین نے اشتراکیت کی راہ اختیار کر لی۔ اس انتخاب سے روس کو بظاہر فتح حاصل ہوئی، لیکن درحقیقت یہ فتح اشتراکیت کی تھی، روسیت کی نہ تھی۔ چین نے جاپان، امریکہ اور روس میں سے کسی ایک کو بھی اپنے لئے منتخب نہ کیا، نہ نمونہ بنایا۔ اس سہ گونہ کشمکش میں چین کی انفرادیت ابھری۔ اور چین نے کسی اور کی راہ اختیار کرنے کی بجائے اپنی راہ لی اور یوں اس نے اپنے آپ کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر لیا۔

چین بیسویں صدی میں ۱۹۴۹ء میں داخل ہوا۔ وہ آیا تو اس قدر تاخیر سے لیکن سالوں کی مسافت دنوں میں طے کر کے یورپ کے حریفانِ تیز گام کو اس نے چند برسوں میں جا لیا۔ اس کی تیز بلکہ برق رفتاری کی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے اپنے لف پا کا وہ سب سے بڑا کانٹا نکال کے آغازِ سفر کیا جس نے ابھی تک اقوامِ ایشیا کو صدیوں کی مسافت پر پچھاڑ رکھا ہے۔ چین پر انقلاب باہر سے مسلط نہیں کیا گیا اور نہ اندر سے چند سرپھرے لوگوں نے ملک پر انقلاب کا ملمع کیا۔ انقلاب دراصل چین کی زندگی کی گہرائیوں سے پھوٹا۔ اشتراکیت کی ظاہری قدر مشترک کی

بنا پر یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ چین نے انقلاب، روس سے مستعار لیا۔ چین نے روس سے سبق ضرور سیکھا۔ اُس نے روس ہی کی طرح مارکس اور لینن ہی کے سرچشمے سے انقلاب کا پیمانہ بھرا اور چھلکایا۔ لیکن چین اور روس کی مثالیں ایک دوسرے پر منطبق نہیں ہوتیں۔ روس کا انقلاب شہری اور محلاتی تھا۔ یہ طوفان ان عوام کا اٹھایا ہوا نہیں تھا جن کی بالا دستی کو آبائے اشتراکیت نے اصل واساس بھی قرار دیا تھا اور مقصود و ملتہا بھی۔ چین کا انقلاب دیہات سے اٹھا۔ قائدینِ انقلاب نے جمہور کو ساتھ لیا، ان کے ساتھ چلے، انہیں ساتھ چلایا۔ اس قافلۂ انقلاب میں محتاج و غنی ایک ہو گئے۔ وہ دوش بدوش آگ اور خون کے دریا کی موج در موج کشاکش سے پار ہوتے، اور اُس نئے چین کی حدود میں داخل ہو گئے جس کے کردار کا مظاہرہ دنیا دیکھ کے دنگ ہو ہو جاتی ہے۔ انقلاب کے ان بیک وقت قائدین و کارکنان نے اپنی کوئی علیحدہ دنیا آباد نہیں کی۔ ذاتی مفاد اور خصوصی اجارہ داریوں کی پناہیں ان کے ہاں نہیں ملتیں۔

انقلابِ چین کی دو خصوصیات سنجیدہ مطالعہ اور گہرے تجزیے کی مستحق ہیں۔ اہلِ چین مارکس، لینن، اور ماؤ کا ہر مقام پر چرچا کرتے سنائی دیتے ہیں۔ وہ ان کے ناموں کا ورد کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے، جیسے وہ شخصیت پرستی میں ضرورت سے زیادہ دور نکل گئے ہیں۔ یہ تاثر نگاہِ غلط انداز کا کرشمہ ہے، حقیقت کا مظہر نہیں۔ اب چین کے متعدد متعصب مغربی نکتہ چین بھی یہ کہنے پر آ گئے ہیں کہ چین میں زور ذات پر نہیں تعلیمات پر ہے۔ چین کے نزدیک مارکس، اشتراکیت کا "پیغمبر" ہے تو لینن اور ماؤ اس کے سچے جانشین ــــ وہ ان میں کوئی خاص فرق نہیں کرتا۔ اس کا عقیدہ ہے کہ ان اصحابِ ثلاثہ کی تعلیم ہی اشتراکیت کو زندہ اور رواں دواں رکھ سکتی ہے۔ ماؤ ان کے نزدیک اشتراکی اصولوں کا صحیح ترجمان بھی ہے اور ان اصولوں پر عمل پیرا چین کا مخلص راہنما بھی ــــ ماؤ سے اہلِ چین کی عقیدت اُس کے ماضی کی وجہ سے ہی نہیں، اس کے حال کی بدولت بھی ہے۔ زورِ ایمان اور جوشش کردار سے ماؤ چین کا راہنما تھا، اور راہنما ہے۔ اس کے ایمان و عمل کا چشمہ جاری رہے گا تو اُس کی قیادت ہر ایک کے نزدیک مسلّم رہے گی ــــ چین کے رویّے میں قرآن کی اس آیت کی رُوح کارفرما نظر آتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ محمدؐ ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزرے ہیں۔ اگر وہ فوت ہو جائیں، یا قتل ہو جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ ــــ تعلیمات، ان کے نزدیک شخصیت پر مقدم ہیں۔

انقلابِ چین کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اشتراکی قائدین، روحِ انقلاب کو مسلسل زندہ رکھنے کا شعور رکھتے ہیں اور اس کے لئے کوشاں ہیں۔ تاریخ میں دیکھا گیا ہے کہ ہر انقلاب ایک وقت کے بعد حرکت و عمل کی قوت کھو بیٹھتا ہے، کیونکہ اس کے پیروکار مفادات کے تحفظ میں لگ جاتے ہیں اور روحِ انقلاب کو

فراموش کر دیتے ہیں۔ اشتراکیت اس دور میں داخل ہو چکی ہے۔ اس کا داعیٔ اوّل یعنی روس اب اس کے بارے میں پہلے کا سا اشتداد ظاہر کرنا تو ایک طرف رہا، وہ کسی خاص جوش و خروش کا مظاہرہ بھی نہیں کرتا۔ اب وہ اشتراکیت کا نقیب نہیں رہا بلکہ امریکہ کے قریب ہو کے اور اس سے مفاہمت کر کے صرف اپنے یعنی روس کے ملکی مفاد کا نگہبان بن چلا ہے۔ دولت کی فراوانی نے اس کا مزاج اشتراکی سے قومی بنا دیا ہے۔ ان حالات میں چین روس کے نقشِ قدم پر چلنا کافی سمجھے تو اشتراکیت بے جان جسم ہو کر رہ جائے۔ چین نے ایسا نہ کیا۔ اس کے برعکس اس نے بہت کوشش کی کہ روس پھر سے خالصۃً اشتراکی اصولوں کو اپنا لے اور قومی مملکت کی بجائے تصوراتی مملکت بن جائے۔ روس کے رجحانات میں کوئی تبدیلی نہ دیکھ کر وہ اسے بھی ایک طرح کا غیر اشتراکی ملک سمجھنے پر آ گیا ہے۔ چونکہ روس اشتراکی تھا، اور اب چین کے معیار کا اشتراکی نہیں رہا، اس لئے چین اس پر اشتراکی اصولوں سے انحراف کرنے اور انہیں بدلنے کا الزام اعلانیہ عائد کرنے لگا ہے۔ چین، روس کو "منحرفین" اور "مترفین" میں سے سمجھتا ہے۔ روس کو اس صف میں رکھ کر وہ اس کی احتیاط کرتا دکھائی دیتا ہے کہ خود اس کے ہاں انقلاب کا وہی حشر نہ ہو جو اس کے خیال میں روس میں ہوا۔ چنانچہ قائدینِ انقلاب نے اپنے آپ کو قوم کے روبرو کر لیا ہے اور اُسے آزادی ہے کہ وہ ان کا محاسبہ کرتی رہے اور انقلاب کی رگوں میں نیا خون دوڑاتی رہے، تاکہ تازہ دم انقلابی اُبھرتے رہیں، اور نہ انقلاب کی رو مدھم پڑے اور نہ انقلاب کے مقاصد شخصی مفادات کی نذر ہو کر تشنۂ تکمیل رہ جائیں۔ چین کی یہ مساعی کہاں تک نتیجہ خیز ہوتی ہیں، یہ دیکھنے کی بات ہے لیکن یہ رجحانات خوش آئند ضرور کہے جا سکتے ہیں۔

اقبالؒ نے خطبات میں کہا ہے کہ حیات اپنے تقاضوں کو سمجھتی ہے۔ اور نازک موقعوں پر از خود اپنا رُخ متعین کر لیتی ہے۔ شاید ہمارے دیکھتے دیکھتے حیات ایسے رُخ بدل رہی ہے۔ واضح نتائج تو دوسری نسلیں ہی دیکھ سکیں گی لیکن یہ موڑ تاریخ کے فیصلہ کن مقامات نظر آتے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کی قیامت سے دو انقلاب پھوٹے۔ ایک روس میں، دوسرا ترکی میں۔ ان دو ہمسایوں نے دو مختلف تجربات کئے۔ ایک تجربہ عیسائیت کا تھا، دوسرا اسلام کا۔ روس عیسائیت ترک کر کے 'لادین اشتراکی' ہو گیا اور ترکی مسلمان رہتے ہوتے بھی لادین نظریۂ مملکت اپنانے پر آ گیا۔ دونوں تجربے ایک ہی تصویر کے دو رُخ نظر آتے ہیں ــ گو یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں رُخ ایک کب دکھائی دینگے ــ بالآخر یہ تصویر ایک ہی نظر آئے گی، صاف اور روشن! حیات اپنی گہرائیوں میں سے اس تصویر کے خدوخال کو یوں ابھارے چلی آ رہی ہے کہ اب اس رازِ خدائی کو زبان کہنے پر آ گئی ہے۔ دونوں تجربوں سے ابتداءً یہ مترشح ہوتا تھا کہ مذہب بہ حیثیت نظامِ عمرانی کی اساس کے، اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ روس میں مذہب کی جگہ اشتراکیت نے لے لی تھی اور اس طرح اُس عمل کی تکمیل کر دی تھی جو سنہ ہوں

صدی میں یورپ میں شروع ہوا تھا۔ لوتھر کی بغاوت نے عیسائیت کی عالمگیریت کو ختم کر کے قومی کلیساؤں کی طرح ڈال دی تھی اور مذہب کو نجی سطح پر پہنچا دیا تھا۔ بیسویں صدی میں لینن کے روس میں مذہب کی نجی حیثیت بھی ختم ہو گئی۔ گویا لوتھر سے لینن تک عیسائیت دم توڑ گئی۔ روسی تجربے کے ساتھ ترکی تجربے نے اہل اسلام کے لئے بھی تشویش کی صورت پیدا کر دی۔ مخالفین کی طرف سے خصوصیت سے کہا جانے لگا کہ اسلام کا حشر بھی عیسائیت سے مختلف نہیں ہوگا۔ کیونکہ جو ترک صدیوں سے اسلام کے علمبردار اور اس کے بازوئے شمشیر زن چلے آ رہے تھے، وہ بھی یورپ کا نظم سیاسی اختیار کرنے پر آ گئے تھے۔ عیسائیت کے تجربے کی روشنی میں یہ امکان یقینی نظر آنے لگا تھا کہ اگر آج ترکوں جیسے مسلمانوں نے دین اور سیاست کی دوئی کو عملاً تسلیم کر لیا ہے تو کل اسکا منطقی نتیجہ نکلے گا اور مسلمان اسلام کو بھی خیرباد کہہ دینگے۔

بدیہی طور پر یہ استنباط غلط نہیں تھا لیکن اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی خدشات عاجلانہ اور نادرست تھے۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو دونوں تجربوں نے اسلام کا راستہ روکا نہیں، اور صاف کیا ہے۔ ترکوں کی بغاوت اسلام کے خلاف نہیں، اُس ملائیت کے خلاف تھی جو اسلام کی زندگی بخش اور مبنی برحقائق تعلیمات کو شخصی مفادات کی سطح پر لے آئی تھی۔ ترکوں کا اقدام اس بنا پر منفی تھا کہ وہ بعض ان خرافات سے تو نجات پا گئے جن میں امتِ ترکیہ کھو گئی تھی لیکن وہ دین کی تشکیل نو نہ کر سکے۔ یہیں سے اسلام کے مستقبل کے بارے میں شبہات پیدا بھی ہوئے اور پیدا کئے بھی گئے۔ ترکوں کے تجربے کو روسی تجربے کے ساتھ ملا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ مذہب کا دور ختم ہو گیا ہے اور اب اسلام بھی کوئی دم کا مہمان ہے۔ آج تک بازگشت ڈال کے دیکھا جائے اور زمانے کا مزاج پہچانا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک حد تک ترکوں نے اور مکمل طور پر روسیوں نے خیرباد کہا تھا۔ ان عاری از عقل معتقدات کو جن سے عیسائیت ایک چیستان بن کے رہ گئی تھی اور جو اسلام کا بھی وہی حال کرنا چاہتے تھے، یہ تو دراصل وہی بات باندازِ دگر کہی جا رہی تھی جو قرآن نے چودہ سو سال پیشتر کہی تھی یعنی یہ کہ رسول ان اغلال و سلاسل کو ہٹانے آتا ہے جو انسانیت کے قلب و نگاہ کو جکڑ لیتی ہیں۔ اس صدی میں دستِ فطرت اپنے طور پر ان زنجیروں کو توڑ کر فکر انسانی کو آزاد کرنے میں مصروف تھا۔ ۱۹۱۷ء میں، کہ روس میں انقلاب برپا ہوا، اور ۱۹۲۳ء میں، کہ ترکی نے الغائے خلافت کیا، جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی تھیں، وہ ایک ربع صدی میں چین اور پاکستان کے تجربوں سے رفع ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ روس اور ترکی کے تجربوں میں کوئی ربط نظر نہیں آتا تھا۔ چین اور پاکستان کے تجربوں میں کوئی ربط نظر نہیں آئے گا۔ لیکن مشیت کے انداز سے اپنے اور پیمانے مختلف ہوتے ہیں۔ روس کے بعد چین میں اشتراکیت نے اپنا رخ پھر سے سیدھا کر لیا ہے یا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اس میں خلوص اور ایقان کی نئی رو پیدا کی جا رہی ہے۔

اسی طرح ترکی کے بعد حصولِ پاکستان کے تجربے سے یہ غلط فہمی دور ہونے کے سامان پیدا ہو گئے ہیں کہ اسلام اپنے اندر نظامِ عمرانی کی اساس بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ پاکستان کا مطالبہ خالصۃً اسلام کے نام پر کیا گیا، اور دنیا بھر کی مخالفت کے علی الرغم اسلام ہی کے نام پر منوایا گیا۔ گویا جو کمی ۱۹۲۳ء میں رہ گئی تھی، وہ پاکستان میں ۱۹۴۷ء میں پوری کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی قابلِ غور ہے کہ چین کے اشتراکی تجربے کو حصولِ پاکستان کے اسلامی تجربے سے قریب تر کر دیا گیا ہے۔ روس سے چین اور ترکی سے پاکستان کے خطوط دکھائی تو متوازی دیتے ہیں، لیکن ان کے سرے ایک دوسرے کی طرف جھکتے نظر آتے ہیں۔ ان دونوں خطوں کے چاروں نقطے کرۂ ارض کے اس حصے میں واقع ہیں جس نے تہذیبِ انسانی کو صدیوں غیر متحرک نہیں ہونے دیا۔ اقبالؒ نے پہلی جنگِ عظیم کو دیکھ کے کہا تھا کہ فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے بسنے کے لئے ایک نئی دنیا تلاش کر رہی ہے۔ ترکی اور روس کے خطوطِ انقلاب، پاکستان اور چین پہنچ کر تخیل کی اس خلاقی کو حقیقت میں بدلتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی آنے والی حقیقت کا پرتو ہے کہ جہاں روس اور ترکی ایک دوسرے سے دور ہے، وہاں چین اور پاکستان کے مابین نہ بُعد ہے نہ بُعد پر مبنی غلط فہمی ۔۔۔ اقبالؒ نے چشمِ تصور سے ہمالہ کے جو چشمے اُبلتے دیکھے تھے، وہ اُبلتے دکھائی دے رہے ہیں۔ مشیت اس علاقے میں بہت بڑا تجربہ کرنے میں لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ آدم کا ہنگامِ نمود کب ہوگا، لیکن یہ تیاری اسی مطلعِ فجر کی ہو رہی ہے ؎

ماؤزے تنگ اور قرآن

طلوعِ اسلام کی آئندہ اشاعت میں عنوانِ بالا پر پرویز صاحب کا ایک مبسوط مقالہ شائع ہو رہا ہے یہ اعلان اس لئے کیا جا رہا ہے کہ آپ اطمینان کر لیں کہ وہ پرچہ آپ کو مل گیا ہے۔ پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع دس ۱۰ جنوری تک ضرور دے دیں کیونکہ اس پرچہ کی مانگ بہت زیادہ ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ بعد میں یہ نہ مل سکے۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کے مہینہ کا آغاز ہونے والا ہے۔ اس لئے معمول کے مطابق[1] قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کئے جا رہے ہیں۔ یہ احکام سورۂ بقرہ میں آتے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں۔

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

(۱) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پہلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔

(۲) أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ۔

(۲) یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ۔

(۳) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرے۔

(۴) وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ۔

(۴) اور جو لوگ بہ دشواری روزے رکھ سکیں ان کے لئے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

(۵) فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ۔

(۵) اس کے بعد اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کرلے تو مزید اجر کا موجب ہوگا۔ اگر تم سمجھ بوجھ سکتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ۔

(۶) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

---

[1] ان احکام کو اس سے پہلے بھی ہم کئی بار درج کر چکے ہیں لیکن ہم ان کے اعادہ کی ضرورت ہر سال سمجھتے ہیں اس لئے انہیں پھر دہرایا جا رہا ہے۔

(۷) فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ (۲/۱۸۵)

(۷) لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔

(۸) وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (۲/۱۸۷)

(۸) اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۹) اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ۔ (۲/۱۸۷)

(۹) اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ

(۱) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں، بلکہ پورے مہینے کے)

(۲) روزے میں، اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے، دن کے ختم ہونے تک، کھانا، پینا، اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

(۳) روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں، روزے رکھ کر گنتی پوری کرے۔

(۴) اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے نہ مسافر ہے لیکن کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں، لیکن بڑھاپے یا کسی مزمن تکلیف کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرے۔ ایسے لوگوں کا حکم آیت نمبر ۵ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ وہ روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمائیے کہ اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا ترجمہ — وہ لوگ جو بہ دشواری روزہ رکھ سکیں — کیا ہے۔ حالانکہ اسکا عام ترجمہ — اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں — کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اسلئے کہ اس ترجمہ کی رُو سے مطلب یہ ہو گا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کا منشا یہ نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں

رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اسکا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم صفحہ ۱۳۰ میں ہے۔

طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں جسے انسان بہ مشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے لَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجا لانا ہمیں دشوار ہو۔

اسی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب صفحہ ۱۰۳ جلد ۱۲ میں ہے کہ

طاقت، قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵ جلد ۲ میں فرماتے ہیں کہ

اِلطَّاقَة" دراصل مَکْنَتْ اور قُدْرَتْ کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اَطَاقَ الشَّیْئَ صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو۔ یعنی یہ دشواری اُسے برداشت کر سکتا ہو۔ چنانچہ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور وہ لوگ ہیں جو انہیں کی طرح معذور ہیں۔ یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ اسی بنا پر امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بہ مشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ

طَاقَة" کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جا سکے اور وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ" سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے، منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف صفحہ ۲۲۵ جلد ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ

عربی زبان میں اَلْوُسْعَ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طَاقَة" کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا (آیۂ زیرِ نظر) کے معنی یہ ہوں گے ——— اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔

(روح المعانی صفحہ ۵۹، جلد ۲)

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طَاقَة" کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ" کا ترجمہ ——— اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ——— صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس کا

صحیح ترجمہ یہ ہے کہ — جو لوگ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے اُمت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کرلے چنانچہ عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ میں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں)۔ اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" (صفحہ ۲۶۸، ۲۹۹۔ جلد ۲) میں ہے کہ

> تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے، یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں، ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے۔ اور حضرت انسؓ، ابن عباسؓ، قیس بن السائبؓ اور ابو ہریرہؓ نے ... فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے، قضا نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ،

> اَلَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ سے یہاں مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں۔ جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے، اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں، اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو۔ تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو، روزہ رکھنا گراں گزرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو، ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہے۔ جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت، ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔
>
> (تفسیر المنار۔ صفحہ ۱۵۵، ۱۵۷۔ جلد ۲)

یہ ہیں روزوں کے احکام قرآن کریم کی رُو سے۔ ہم نے صرف احکام سے بحث کی ہے۔ روزے کا فلسفہ بیان نہیں کیا۔ وہ الگ موضوع ہے۔

حقائق و عِبَر

۱۔ ہندوستان کے مسلمان

ہندوستان میں الیکشن قریب آرہے ہیں اور وہاں کی مختلف پارٹیاں اس سلسلہ میں اپنے انتخابی منشور شائع کر رہی ہیں۔ اس ضمن میں ہندو مہا سبھا نے جو منشور شائع کیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ:

> مہا سبھا، دستور میں اس قسم کی ترمیمات کرنے کے حق میں ہے جو ہندو کلچر کی روایات کے مطابق ہوں، اور جس کے نتیجے میں ملک صحیح معنوں میں ایک جمہوری ہندو ریاست بن سکے۔ اقلیتیں کلچر اور مذہب کے معاملہ میں آزاد ہوں گی لیکن اس کے ساتھ ہی منشور میں اس بات پر اصرار کیا گیا ہے کہ انہیں ہندو قومیت کے خاص دھارے میں سمو جانا چاہیئے، اور کلچر اور مذہب کے نام پر ایک علیحدہ قومیت کے تصور کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔ (مدینہ بجنور۔ مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۶ء)

ہندو مہاسبھا کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ متشدد، متعصب جماعت ہے اسی لئے وہ اس ذہنیت کی حامل ہے۔ لیکن سوشلسٹ پارٹی کو فرقہ وارانہ متعصب نہیں کہا جاتا۔ اس کے لیڈر، ڈاکٹر لوھیا نے کہا ہے کہ

> اگر مجھے طاقت حاصل ہو گئی تو میں مسلم پرسنل لاء کو بدلے بغیر کیسے رہ سکتا ہوں؟ ایک اخبار نویس کے اس اعتراض پر کہ آئین میں یہ ضمانت بھی تو دی گئی ہے کہ کسی کے مذہب میں دخل نہیں دیا جائے گا۔ ڈاکٹر لدھیانے کہا کہ یہ مذہب نہیں ہے آئین میں مذہب میں دخل اندازی نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اس کے طریقۂ عبادت

سے نہ روکا جائے گا۔ عبادت گاہوں کے تحفظ میں کوتاہی نہیں کی جائے گی۔

اس اخبار نویس کے اس استفسار پر کہ اس تعبیر کا حق — کہ کیا بات مذہب ہے اور کیا نہیں — کس کو ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جو بات غلط ہے اسے غلط ہی کہا جائے گا۔

اخبار نویس نے پوچھا کہ جس بات کو آپ غلط سمجھتے ہیں اس کو غلط منوانے کے لئے دلیل کا استعمال تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اسے ختم کرنے کے لئے طاقت کا استعمال آپ کس طرح کریں گے؟ انہوں نے کہا کہ ظاہر ہے کہ میں اسے قائل کرنے کی کوشش کرونگا۔ لیکن اگر کوئی قرآن شریف سے یا حدیث سے یہ سند لائے کہ شاہراہِ عام پر رفع حاجت کرنے کا حکم ہے تو میں ہرگز اُسے نہیں مانوں گا۔ (ایضاً)

یہ وہاں کے سوشلسٹ لیڈر کے خیالات ہیں اور خود کانگریس کی حکومت میں جو کچھ مسلمانوں کے خلاف ہو رہا ہے، اس کا کسے علم نہیں؟

یہ ہے وہ حکومت جس کے متعلق مودودی صاحب، تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ پاکستان میں جو حکومت قائم ہوگی، وہ ہندوستان کی کافرانہ حکومت سے بھی بدتر ہوگی۔

اب رہا یہ سوال کہ ہندوستان کا مسلمان جس مصیبت میں گرفتار ہے، اس کا علاج کیا ہے؟ سو اس کا جواب واضح ہے کہ اس کا علاج پاکستان کی طاقت میں مضمر ہے۔ اگر پاکستان اس قدر طاقتور ہو جائے کہ ہندو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے تو وہ وہاں کے مسلمان پر کسی قسم کی زیادتی کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا اور اگر اس کی ذہنیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو حکومت کی سطح پر تبادلۂ آبادی کر لیا جائے گا۔ اور اسی نسبت سے ہندوستان کے رقبے کا حصہ، پاکستان میں شامل ہو جائے گا۔ دنیا میں متبد قوتوں کی دھاندلی کا علاج، طاقت کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لئے خدا نے کتابوں کے ساتھ "فولاد" بھی تو نازل کیا ہے۔

۲۔ ہندو اپنے اصلی رُوپ میں

ہندوستان میں جن سنگھ پارٹی، ہندوؤں کی بے نقاب ترجمان اور نمائندہ جماعت ہے۔ پچھلے دنوں، بمبئی کے قریب "کلیان" میں اس پارٹی کا ایک جلسہ ہوا جس میں اس کے ایک مشہور لیڈر وممبر پارلیمنٹ مسٹر اٹل بہاری باجپائی نے طول طویل تقریر کی۔ یہ تقریر بمبئی (انڈیا) سے شائع ہونے والے روزنامہ "انقلاب"

کی ۳ نومبر کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے اور اس قابل ہے کہ اس کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ وھو ھذا!

کلیان (ڈاک سے) اگر پاکستان کے ساتھ کشمیر کے سلسلے میں کسی قسم کی بھی سودے بازی کی گئی، تو دلی سرکار کا تختہ اُلٹ دیا جائیگا۔ یہ اعلان رات یہاں کلیان اور ڈومبولی جن سنگھی استقبالیہ کمیٹی کے زیرِ اہتمام سبھاش میدان کلیان میں منعقدہ ایک عظیم جلسۂ عام میں جن سنگھی لیڈر ممبر پارلیمنٹ مسٹر اٹل بہاری باجپائی نے کیا۔ آپ نے پر زور الفاظ میں کہا کہ ہم کشمیر کے موقف میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں چاہتے۔ ہمارا موقف واضح ہے اور یہ کہ کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ حصہ ہے اور رہیگا۔ ہم حملہ آوروں کے آگے ہرگز جھک نہیں سکتے۔ آپ نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے سر پر کشمیر کا بھوت سوار ہے۔ اسے ہر معاملے میں صرف کشمیر دکھائی دے رہا ہے۔ مگر پاکستان اب یاد رکھے کہ اب کی جنگ چھڑ گئی تو یہ جنگ لاہور اور سیالکوٹ تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ جنگ کی یہ آگ پشاور تک پہنچ جائے گی اور یہ جنگ سرزمینِ پاکستان پر لڑی جائے گی۔ باجپائی نے کہا کہ آج ہندوستان کے دو سب سے بڑے دشمن ہیں، جن میں ایک طرف چین ہے اور دوسری طرف پاکستان۔ یہ دونوں ہندوستانی سرحد پر تاک لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان دو دشمنوں میں سے ایک مذہب کے سہارے پر قائم ہے تو دوسرا مذہب کا کٹر مخالف۔ مگر اس کے باوجود ہندوستان کو تباہ و برباد کرنے کے لئے یہ دونوں آپس میں ایک ہو گئے ہیں۔ ان دونوں کا گٹھ جوڑ ہم دونوں کی راہ میں حائل ہے مگر ہماری حکومت اس معاملہ میں بڑی نکمی اور بزدل ثابت ہوئی ہے۔ وہ حملہ آوروں کا جواب صرف احتجاج سے دیتی رہتی ہے جبکہ احتجاج سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا ہے۔ اگر احتجاج ہی مسائل کا حل ہوتے اور حملہ آور پسپا ہوتے تو دنیا میں "جنگ" نام کوئی چیز باقی نہ رہتی۔ آپ نے کہا کہ حکومت کا یہ دوسرا کمزور پہلو ہے کہ وہ جھوٹ کو اپنائے ہوئے ہے، اور یہ جھوٹ کی پالیسی نہرو کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ نہرو کے دورِ حکومت میں بھی جب چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس واقعہ کو نہرو کئی کئی دنوں تک چھپاتے رہے لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو راز افشا ہو گیا۔ اسی طرح کشمیر کا ایک تہائی حصہ آج بھی پاکستان کے قبضے میں ہے۔ روپے کی قیمت گرنے کے سلسلے میں بھی جبکہ اس کا عام اعلان نہیں ہوا تھا، ہم نے کئی بار اندرا گاندھی سے پارلیمنٹ میں وضاحت طلب کی، مگر وہ ہر بار افواہ کہہ کر ہمیں ٹالتی رہی اور بالآخر ایک روز آکاش وانی سے اس افواہ کی صداقت کا بھی اعلان ہو گیا۔ آپ نے کہا کہ آج بھی چینی فوجیں بھوٹان میں موجود ہیں مگر جب ہم وزیر اعظم سے اس سلسلے میں سوال کرتے ہیں تو وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرتی

ہیں۔ لیکن اندرا گاندھی کا یہ جھوٹ بھی منظرِ عام پر آجائے گا۔ وزیر اعظم کو چاہیئے کہ وہ ہمیں اندھیرے میں نہ رکھیں۔ ہم چین کی بھوٹان میں مداخلت ہرگز گوارا نہیں کر سکتے۔ اگر چین جنگ چاہتا ہے تو ہم اس کے لئے بھی بالکل تیار ہیں۔ ہندوستان بزدلی کو چھوڑ کر ہمت سے کام لے اور جلد از جلد ایٹم بم بنائے تاکہ ہم دشمنوں کا بھرپور مقابلہ کر سکیں۔ آج چین نت نئے تجربات میں لگا ہوا ہے اور یہ خطرناک ہتھیار کسی پر نہیں بلکہ صرف ہندوستان پر آزمائے گا۔ چین کے اس خطرناک ہتھیار کا نشانہ صرف ہندوستان بنے گا اور اگر ہندوستان نے ایٹم بم نہیں بنایا تو وہ یاد رکھے کہ دشمنوں کے بم ہوں گے اور خالی ہاتھ ہم ہوں گے۔ آپ نے آگے چلکر اپنی تقریر میں کہا کہ ہمیں معاشی اور اقتصادی معاملات میں خود کفیل ہونا چاہیئے تاکہ ہمیں بے شرم بن کر در در اپنی جھولی پسارنا نہ پڑے کہ ہم امریکہ کے حکم کے مطابق پاکستان سے کسی صورت میں جنگ نہیں کریں گے، فوج کی تعداد گھٹا دیں گے اور یہ کہ ہم پاکستان سے جنگ نہ کرنے کا تہیہ اس لئے بھی کر چکے ہیں کہ ہم نے اپنا وزیر ایک عورت کو بنا لیا ہے اور عورت کے ماتحت ہم نہیں لڑ سکتے۔ آپ نے کہا کہ بزدلی، بے حیائی اور بے غیرتی کی حد ہو گئی ہے۔ اب اس سے زیادہ ہمیں ذلیل نہیں ہونا چاہیئے۔ ناجائز غیر ملکی دباؤ میں نہیں آنا چاہیئے۔ ہمیں اپنے قدموں پر کھڑا ہونا ہوگا، ہماری حفاظت کے لئے ایٹم بم بنانا ہوگا، فوج کی تعداد بڑھانا ہوگی، دشمنوں کو منہ توڑ جواب دینا ہوگا ہم اسی صورت میں سُرخ روئی حاصل کر سکتے ہیں، اسی صورت میں ہم ملک پر اور ملک ہم پر ناز کر سکتا ہے۔

آپ ہندو کی اس ذہنیت اور اس کے مشئوم عزائم سے اندازہ لگا لیجئے کہ پاکستان کس قسم کے خوفناک کوہِ آتش فشاں کے دامن میں بیٹھا ہے۔ اگر ہم اس خطرہ سے ایک لمحہ بھر کے لئے بھی غافل ہو گئے تو اس کا لاوا سیلِ بے پناہ کی طرح امنڈ کر آجائے گا۔

۳۔ ایک بہت بڑا خطرہ اور اسکی مدافعت

لائل پور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "المنبر" کی ۱۸ نومبر کی اشاعت میں حسب ذیل مقالہ افتتاحیہ شائع ہوا ہے۔

لندن سے فراہم شدہ ایک خبر کا خلاصہ یہ ہے کہ

"بھارت اور امریکہ میں ایک خفیہ سمجھوتہ طے پاگیا ہے جس کے تحت بھارتی حکومت مناسب مقامات پر امریکہ کو فوجی اڈے تعمیر کرنے کی سہولتیں فراہم کرے گی۔ یہ سمجھوتہ دونوں ملکوں میں طویل صلاح مشوروں کے بعد طے پایا ہے اور اس کے نتیجہ میں امریکی حکومت بھارت کو اقتصادی امداد اور بھاری مقدار میں اناج فراہم کرنے پر رضامند ہوئی ہے۔ امریکہ کے ممتاز اخبارات میں جن میں نیویارک ٹائمز بھی شامل ہے کل یہ خبر شائع کی ہے۔ اس کے مطابق اقتصادی امداد کے بارے میں اور خاص طور پر اناج کے معاملہ میں امریکہ نے اپنا رویہ انتہائی سخت کر لیا تھا۔ اور یہ صورت حال اس وقت تک جاری رہی جب تک بعض بین الاقوامی امور اور امریکی مفاد کے کچھ اہم معاملات میں بھارت نے اپنا رویہ تبدیل نہیں کیا۔ اس مقصد کے لئے کئی بھارتی وزراء نے امریکہ کے دورے کئے، خارجہ اور دفترِ خارجہ کے دوسرے حکام سے متعدد ملاقاتیں کیں۔ ان اخباروں کے مطابق بھارت اور امریکہ کے تعلقات میں تلخی ویت نام کے بارے میں مسز اندرا گاندھی کے ایک بیان سے پیدا ہوئی تھی جسے امریکہ کے دفترِ خارجہ نے انتہائی اشتعال انگیز اور وہی موقف کے عین مطابق قرار دیا۔ بعد میں بھارتی حکومت نے اس بیان کی اس طرح وضاحت کرتے ہوئے یہ کوشش کی کہ امریکہ مطمئن ہو جائے، لیکن اُسے ناکافی قرار دیا گیا اور بھارت سے واضح رویہ اختیار کرنے کو کہا گیا۔ بعد میں دونوں ملکوں میں ایک سمجھوتہ طے پاگیا جس کے تحت امریکہ نے بھارت کو اقتصادی امداد اور اناج دینا منظور کر لیا اور دوسرے ملکوں سے بھی فوجی امداد اور ساز و سامان کے حصول میں بین الاقوامی سطح پر کسی قسم کی مخالفت نہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔

اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے "المنبر" رقمطراز ہے:۔

امریکی اور بھارتی استعمار کی یہ سازش امنِ عالم کے لئے کتنا بڑا چیلنج ہے۔ غالباً اسکی وضاحت غیر ضروری ہے، لیکن یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ بھارتی اور امریکی استعمار پسندوں نے جہاں چین، برما اور دوسرے ممالک کے لئے بے پناہ خطرات پیدا کئے ہیں، وہاں بھارت کے سب سے قریبی ملک پاکستان کے ایک جانب تو خطرات کا دروازہ کھول دیا ہے اور دوسری طرف باشندگانِ پاکستان کو جھنجھوڑ دیا ہے اور ان پر واضح کر دیا ہے کہ اگر وہ اپنی آزادی، اپنی سالمیت، اپنے ضمیر اور اپنے سیاسی ذہن کو مارکیٹ کا بکاؤ مال بنانے سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، اور اگر انہیں یہ پسند نہیں ہے کہ اپنے ملک کو اور اپنی آئندہ نسل کو استعمار کا غلام خود اپنے ہاتھوں بنائیں، تو انہیں غلے میں خود کفیل ہونا چاہیئے اور امریکی امداد سے سُرخ روئی حاصل کرنی چاہیئے:۔

ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جب پاکستان سے پانچ گنا بڑا ملک غلے کی قلت کے باعث اپنے ہاں امریکی ہوائی اڈوں کو قائم کرکے امریکہ کی نوآبادی بننا قبول کر لیتا ہے، تو پاکستان چھوٹا ملک ہوتے ہوئے اس غلے کی کمی کے ہاتھوں کیونکر بے بس نہیں ہو گا اور امریکی استعمار کی من مانی کو قبول نہیں کرے گا۔

اس میں کلام نہیں کہ مغرب کے استعمار پرست ممالک چھوٹے ملکوں کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر اپنے سیاسی مفاد حاصل کرتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ یہ چھوٹے ممالک اتنے خود کفیل ہو جائیں کہ ان بڑے ممالک کے دست نگر نہ رہیں۔

طلوعِ اسلام

غلہ کی وجہ سے پیدا ہونے والے خطرہ کے متعلق دنیا کے تحقیقاتی اداروں کا تجزیہ یہ ہے کہ اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔

(۱) امریکہ اور کینیڈا میں برآمد کی وجہ سے غلہ کے ذخائر میں کمی آ رہی ہے اور اناج کی پیداوار بھی سابقہ فصلوں کی نسبت کم ہو رہی ہے۔

(۲) دنیا کی آبادی اس سرعت سے بڑھ رہی ہے کہ غلہ کی پیداوار کی تیز تر رفتار بھی اس ضرورت کو بمشکل پورا کر سکے گی۔

لہٰذا، اس خطرے سے بچنے کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ غلہ کی پیداوار بڑھانے میں زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے، اور ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لئے، خاندانی منصوبہ بندی پر سختی سے عمل کیا جائے۔ دنیا کے دیگر ممالک ان تدابیر پر شدت سے عمل کر رہے ہیں، لیکن ہمارے ہاں صورت یہ ہے کہ غلہ کی پیداوار بڑھانے کے لئے حکومت امکان بھر کوشش کر رہی ہے لیکن جب وہ بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کی تدابیر اختیار کرنے کو کہتی ہے تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے شور مچا دیا جاتا ہے کہ یہ خلاف اسلام ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ کون سا اسلام ہے جو انسان کو اس بات سے روکتا ہے کہ وہ اتنے ہی بچے پیدا کرے جتنے بچوں کی پرورش کا وہ کفیل ہو سکے؛ لیکن ان حضرات کے اسلام کے مطابق صورت یہ ہے کہ

(۱) قوم کا فریضہ ہے کہ وہ دھڑا دھڑ بچے پیدا کئے جائے ۔۔۔ اور

(۲) حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان تمام بچوں کی روٹی کا انتظام کرے۔

اگر وہ ان کی روٹی کا انتظام نہیں کر سکتی، تو شور مچا دیا جاتا ہے کہ حکومت نااہل ہے جو رعایا کی روٹی کا بھی بندوبست نہیں کر سکتی۔

اور اگر وہ رعایا کے بے تحاشا پیدا کردہ بچوں کی روٹی کے لئے باہر سے غلہ منگواتی ہے تو شور مچا دیا جاتا ہے کہ انہوں نے ملک کو بیچ دیا ہے۔ ہمیں غیروں کا غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔

غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را

آپ سوچئے کہ اس طرح دنیا کی کوئی حکومت بھی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے؟ یہی تھیں وہ مشکلات جن کے پیش نظر صدر ایوب نے پچھلے دنوں لاہور میں بنیادی جمہوریت کی کنونشن کا افتتاح کرتے ہوئے اپنے خطاب میں کہا تھا کہ۔

> جو لوگ خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت کرتے ہیں وہ درحقیقت ایسی جونکیں ہیں جو جسدِ ملت کا خون چوس رہی ہیں۔ یہ مفت خورے اس قسم کی باتیں کرتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ جس شخص نے محنت اور مشقت سے اپنے بچوں کا پیٹ پالنا ہو، وہ کبھی یہ نہیں کہے گا کہ خاندانی منصوبہ بندی مفید نہیں۔ انہیں چاہیئے کہ یہ دلانے حجروں سے باہر نکلیں ـــ کام کریں ـــ اور لوگوں کی معاشی حالت کا جائزہ لیں۔ پھر انہیں معلوم ہوگا کہ بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی کا پیٹ کس طرح سے بھرا جا سکتا ہے۔
>
> (پاکستان ٹائمز۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۶ء)

لیکن اصل مسئلہ اس سے کہیں گہرا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ وہ ثنویت ہے جس کی رو سے ملک کے "دنیاوی معاملات" حکومت کی تحویل میں ہیں اور "امور شریعت" مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں۔ یہی وہ ثنویت تھی جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اور جسے قائم رکھنے کے لئے یہاں ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے۔ اور خود حکومت بھی اس باب میں کوئی صحیح اقدام نہیں کرتی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا جو اس وقت ہو رہا ہے ـــ اس وقت ہو کیا رہا ہے؟ حکومت، افرادِ مملکت کی بہبود کے لئے کوئی تجویز سامنے لاتی ہے اور مُلّا شور مچا دیتا ہے کہ یہ خلافِ شریعت ہے۔ اور اس طرح عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیتا ہے۔ حکومت دوراہے میں کھڑی بے بس رہ جاتی ہے۔ اس تجویز کو مسترد کرتی ہے تو ملک کو نقصان پہنچتا ہے، اسے اختیار کرتی ہے تو مُلّا عوام کو بھڑکا دیتا ہے۔

یاد رکھیئے! اس کا علاج وہی ہے جسے اسلام نے پیش کیا تھا۔ یعنے دین اور سیاست (یعنی دنیاوی معاملات اور شرعی امور) کا کنٹرول ایک ہی مرکز میں ہو۔ یہی خدا کا حکم ہے اور یہی اس کے رسولؐ کی سنت، اور خلافتِ راشدہ کا عمل ـــ اس سے دین اور دنیا، دونوں کی برکات حاصل ہونگی۔

اور اگر ایسا کرنے کی ہمت نہیں تو پھر کھلے بندوں سیکولر نظام اختیار کیجئے۔ دین تو نہ اِسونت

ہے۔ نہ اُس وقت ہوگا۔ لیکن اُس وقت کم از کم دُنیاوی معاملات تو عقل و فکر کی رُو سے طے ہو سکینگے۔

موجودہ "مذبذبین بین ذالک" کی روش کا نتیجہ تو دین اور دنیا دونوں کی بربادی ہے۔ اسی لئے اسلام نے اسے مٹایا تھا۔

۴۔ ہماری تاریخ

طلوع اسلام ایک عرصہ سے اس حقیقت کو بے نقاب کرتا چلا آرہا ہے کہ ہماری قرنِ اول کی تاریخ میں (جس میں کتب روایات بھی شامل ہیں) بدقسمتی سے اس قسم کا مواد ملتا ہے جس سے حضور نبی اکرمؐ کی شانِ اقدس و اعظم پر سخت طعن پڑتا ہے۔ اور صحابہ کرامؓ کی سیرتِ طیبہ بڑی داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ طلوع اسلام نے اس قسم کے واقعات کو بار بار سامنے لا کر گزارش کی کہ ان کتابوں کو ان بہتانات سے پاک کیا جائے تاکہ نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت صحیح شکل میں دنیا کے سامنے آسکے۔

طلوع اسلام کی اس تجویز پر ہمارے قدامت پرست مذہبی طبقہ کی طرف سے حسبِ عادت شور مچا دیا گیا کہ یہ دین کے خلاف بہت بڑی سازش ہے۔ یہ ہمیں ہمارے ماضی سے بیگانہ کر دینا چاہتا ہے۔ یہ بڑی خطرناک تجویز ہے۔ اس سے محتاط رہنا ــــ اور اس شور و غوغا میں سب سے پیش پیش جماعت اسلامی تھی۔

جماعت اسلامی اِدھر تو یہ شور مچا رہی تھی اور اُدھر اُن کے امیر حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ مبارک اور صحابہ کبارؓ کے خلاف شرمناک اتہامات لگانے میں مصروفِ جہاد تھے (اس کی تفصیل ہم کسی دوسرے وقت پیش کریں گے) حتیٰ کہ انہوں نے، پچھلے دنوں حضرت عثمانؓ کے خلاف اس قدر زہر افشانی کی کہ خود قدامت پرست حلقہ میں بھی اضطراب پیدا ہوگیا۔ اس کے خلاف مختلف اخبارات اور رسائل میں تردیدی مضامین شائع ہوئے[1]۔ لیکن ان سب کے جواب میں، مودودی صاحب کا ایک ہی جواب تھا اور وہ یہ کہ میں نے یہ سب کچھ مستند کتب تاریخ سے لے کر شائع کیا ہے۔ اس پر اس حلقہ نے محسوس کیا ہے کہ ہماری تاریخ فی الواقعہ تنقید و تہذیب کی محتاج ہے اور اس پر غائرانہ نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ

---

[1] مولوی صاحبان کے اس قدر احتجاج کے باوجود، مودودی صاحب نے اب "خلافت و ملوکیت" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کر دی ہے جو غالباً انہی مضامین پر مشتمل ہے۔

اس سلسلہ میں "المنبر" (لائل پور) کی ۴ نومبر کی اشاعت میں "دین حق کے خلاف فتنے اور ہمارا فرض" کے عنوان سے رحیم آباد کے سردار محمد اجمل خان لغاری کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جو اس قابل ہے کہ اسکا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:-

آپ سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ ہر زمانہ میں دین اسلام کے خلاف بیشمار فتنے نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ فی زمانہ بھی ایک اہم اور خطرناک فتنہ وہ ہے جس کے ذریعہ دین کو مسخ اور اس میں تحریف کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قرآن و سنت اور دین و شریعت کے مطالب و معنے کو مسخ کرنے کی جو کوشش جدید فتنہ پردازوں کی طرف سے کیجا رہی ہے۔ الحمدللہ علمائے حق کی طرف سے اُن کا دنداں شکن اور کماحقہ جواب دیا جا رہا ہے۔

لیکن اسی قبیل کا ایک فتنہ جس کی طرف بالعموم اردو زبان میں پوری توجہ نہیں دیجا سکتی وہ تاریخ اسلام کو مسخ کرنیکا فتنہ ہے۔ اگرچہ مولانا عبدالشکور صاحب نجیب اکبرآبادی، سید نورالحسن شاہ صاحب بخاری، مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی اور ترجمان الاسلام جیسے دینی پرچوں میں لکھنے والے حضرات کے ساتھ ساتھ دیگر علمائے کرام کی منفرد کاوشوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان کے مخصوص حالات کے پیش نظر مطلق ان کی انفرادی عرق ریزیوں سے فتنہ کا استیصال محال نظر آتا ہے۔

بدقسمتی سے تاریخ اسلام کو ترتیب دینے کے وقت سے ہی یہ علم بیشتر ایسے ہاتھوں میں رہا ہے جس کا پایہ ثقاہت محدثین کرام فقہائے عظام کے درجہ کا نہیں تھا۔ اور جامعین تاریخ نے بعض مصالح کی بناپر رطب و یابس کو اپنے مجموعوں میں جمع کر ڈالا ہے۔ نیز تاریخ اسلام کو امام بخاری اور امام مسلم جیسے محققین روایت میسر نہ آسکے اور یہ ذخیرہ جوں کا توں منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ چنانچہ دشمنانِ اسلام بالخصوص یورپ کے عیسائی مشنریز اور مستشرقین نے اس ذخیرہ سے باطل افسانے لیکر اسلام، پیغمبرِ اسلام، صحابہ کرام اور صلحاء امت کی سیرتوں کو نعوذ باللہ بزعم خود داغدار بنا کر دنیا کے سامنے بار بار رکھنے کی سعی کی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ دوسری طرف اس ذخیرۂ تاریخ سے جو درسی و معلوماتی کتب تاریخ ترتیب دی گئی ہیں، ان میں بھی کسی قسم کے نقد و امتیاز کو کام میں نہیں لایا گیا ہے۔ اور بلا تحقیق و صحت فتنہ انگیز مواد ان کتابوں میں بھی جمع کر دیا گیا ہے۔ آج یہی مواد تاریخ اسلام کے نام سے اسکولوں و کالجوں میں پڑھایا اور عام مطالعہ کے لئے پیش کیا جا رہا ہے جس کا یہ افسوسناک نتیجہ نکل رہا ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل اکابرِ اسلام کے متعلق

سخت قسم کی سوئے ظنی میں مبتلا ہو جا رہی ہے اور اسلاف کے ساتھ نئی نسل کے رشتہ دامن میں برابر اضمحلال پیدا ہو رہا ہے۔

اس تشویشناک صورت حال کو روکنا ضروری اور وقت کی دینی خدمت ہے۔ ادارہ اجمل باغ رحیم آباد خدمت تعلیم و دین کا ہی ایک ادارہ ہے۔ اس نے تاریخ اسلام کے بارے میں اس فروگذاشت کو گہری تشویش کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اور اس سے پیدا ہونے والے عواقب کی خطرناکیوں پر نظر ڈالی ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ تاریخ اسلام پر ایسا تحقیقی کام نہایت ضروری ہے جو حقیقت کو افسانہ اور صحیح کو غلط سے علیحدہ کر کے اسلام کی منقح تاریخ پیش کر سکے۔ اس مقصد کے لئے وہ آپ سے التماس کرتا ہے کہ آپ اپنے علم و فضل کی روشنی میں اپنے حالات کے تابع ممکن حد تک اس فتنہ کا استیصال جس طور پر فرما رہے ہیں اُسے جاری رکھیں البتہ ادارہ کے لئے ایک ایسا مفصل خاکہ و تبصرہ مع ان تمام کتب قدیم و جدید کے ناموں کے جو اس موضوع پر کارآمد ہو سکیں مرتب فرما دیں تاکہ ادارہ آپ کے فراہم کردہ تبصرے و تفصیلات کی روشنی میں اس اہم کام کی انجام دہی پر غور کر سکے۔

کام کی اہمیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اسے سرسری نہ سمجھا جائے اور تاخیر و التوا میں ڈالے بغیر اس کی طرف پوری توجہ مبذول فرمائی جائے۔ چنانچہ امید ہے کہ اپنی اہم ترین مصروفیات کے باوجود اپنا کچھ قیمتی وقت اس باب میں صرف فرمائیں گے۔ اجر تو اللہ ہی دے گا جو سب کا دینے والا ہے

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس تجویز کا حشر کیا ہوگا اور کوئی ادارہ اگر تاریخی تنقید کے اہم فریضہ کو لے کر بیٹھا بھی تو وہ کس نگاہ سے اس پر تنقید کرے گا اور کس حد تک اس میں کامیاب ہوگا۔ لیکن اس سے بہر حال، ایک جمود تو ٹوٹا۔ اور جس چیز کو طلوعِ اسلام کے خلاف گویا، ارتداد کہا جا رہا تھا، وہ بالآخر خدمت دین قرار پا گئی۔

اب ہمیں انتظار ہے کہ کتب احادیث کے متعلق بھی اسی قسم کی تجویز کب سامنے آتی ہے کہ ان میں بھی اس قسم کا مواد کچھ کم نہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی (مرحوم) جو دیوبندی مکتب فکر کے ایک جید عالم تھے، اور تو اور، بخاری کی احادیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

میں، بخاری کی بعض احادیث کو، نوجوانوں کو، بالخصوص ایک یورپین نو مسلم کو نہیں پڑھا سکتا۔ اس باب میں میری مشکلات کیا ہیں اور انہیں وہ کتاب کیوں نہیں پڑھا سکتا، ان تفاصیل پر میں مجلس عامہ میں گفتگو کرنے کا روادار نہیں۔ اہل علم جو تکمیل کر چکے ہیں یا تکمیل کے قریب ہیں ان سے میں مذاکرات میں سب کچھ کہہ دوں گا۔ (مقام حدیث۔ جدید ایڈیشن صفحہ ۱۳۰-۲۴۹)

کتبِ تفسیر

یہی (مولانا سندھی مرحوم) کتبِ تفسیر کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ــــ ہم نے امام فخرالدین رازی کی تفسیر پڑھی۔ نیز جاراللہ زمخشری کی کتاب کا مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ معالم التنزیل از فراء بغوی اور تفسیر حافظ ابن کثیر پڑھی۔ ان سب تفسیروں کے ذریعے ہم نے قرآن سمجھنے کی اپنی استطاعت کے مطابق پوری کوشش کی۔ لیکن سوائے تحیر کے ہمیں کچھ نصیب نہ ہوا۔ اگر زمانہ طالب علمی میں ہم نے نجم الائمہ حضرت شیخ الہند سے چند آیتوں کی تفسیر جو کتابوں میں نہیں ملتی، نہ سنی ہوتی اور ہمارے لئے وہ اطمینان کا ذریعہ نہ بنتی نیز شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بعض تفسیری جملے نہ پڑھے ہوتے، تو قدما کی ان تفسیروں کو پڑھ کر ہم علمِ تفسیر کے حصول سے قطعاً مایوس ہو جاتے۔ بیشک ہم اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ پہلے زمانے میں مسلمانوں نے انہی کتابوں کی مدد سے قرآن سمجھا تھا، اور انہی اصول و قواعد پر انہوں نے اپنے اجتہاد کے مطابق قرآن کی حکومت قائم کی تھی۔ لیکن جہاں تک اس زمانے کا تعلق ہے، ہمارے لئے اس قسم کی تفسیروں سے قرآن فہمی ناممکن ہے۔

(ماہنامہ "الرحیم" ستمبر ۱۹۶۵ء)

۶۔ ہم تنہا نہیں

امریکہ کے ایک ماہر فلکیات، ڈاکٹر ہارلو شاپلے (HARLOW SHAPLEY) نے کہا ہے کہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ زندگی صرف کرۂ ارض پر ہے، باقی اجرام فلکی پر کوئی جاندار اشیاء نہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ کائنات میں دس کروڑ سے زیادہ اجرام فلکی (PLANETS) ایسے ہیں جن میں زندگی پائی جاتی ہے۔ "زندگی سے مراد ہے گھاس، درخت اور جاندار اشیاء (PEOPLE)۔ اس کے اس خیال کی تائید وہاں کے تین اور سائنسدانوں نے بھی کی ہے۔ (رائٹر۔ بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۵ء)

قرآن کریم سائنس کی کتاب نہیں، لیکن کائنات کے متعلق جہاں اس نے کوئی ضمناً بات بھی کہہ دی ہے ہو نہیں سکتا کہ سائنس کے صحیح انکشافات اس کی تائید نہ کریں۔ اس نے تیرہ سو سال پہلے یہ کہا تھا کہ ــــ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ۔ "اور آیاتِ خداوندی میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے زمین اور اجرامِ سماوی کو پیدا کیا اور ان میں (ارض و سما دونوں میں) جاندار مخلوق پھیلا دی۔" یعنی ارض و سما۔ دونوں میں جاندار مخلوق ہے۔

اور اس کے بعد ہے ــــ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ۔ (۴۲/۲۹) اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق کسی دن ان مخلوقات کو ایک دوسرے سے ملا دے۔"

اس وقت ساکنانِ ارض کی اجرامِ سماوی تک پہنچنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، کچھ عجب ان سے وہ ایک دن کسی ایسے کرہ میں بھی پہنچ جائیں جس میں زندگی مصروفِ خرام ہو۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی اور کرہ کی مخلوق، جو رموزِ کائنات کی واشگافی میں ہم سے بھی آگے ہو، ہم تک پہنچ جائے۔ قرآنِ کریم بہرحال ان آبادیوں کے باہمد گر مل جانے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ کس قدر بلند صداقت ہے اس کے اس دعوےٰ کی ــــ کہ

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۔ (۴۱/۵۳)

ہم انہیں عالمِ انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تا آنکہ یہ بات حقیقت بنکر سامنے آجائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا تھا، سچ تھا۔

قرآن کے ان دعاوی کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا اس قوم کا فریضہ تھا، جسے اس کتابِ عظیم کا وارث بنایا گیا تھا۔ لیکن ہم پر تو زمین کے ہنگامے بھی سہل نہیں ہو رہے ہیں، ہم آسمان کی خبریں کیا لائیں گے ــــ اتنی بلند راہ نمائی رکھنے کے باوجود ایسی انتہائی پستی پر شاید ہی دنیا کی کوئی اور قوم اتری ہو۔

۷۔ میری نگاہِ شوق پر اس درجہ سختیاں!

مودودی صاحب نے اپنے درسِ قرآن وحدیث میں (جس کی روئیداد اخبار ایشیا بابت ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی ہے، پہلے یہ حدیث بیان کی:

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں پہلے قبروں پر جانے سے روک دیا تھا۔ اب تمہیں اس کی اجازت ہے (یعنی اب قبروں کی زیارت کے لئے جا سکتے ہو) میں نے تم کو منع کر دیا تھا اس بات سے کہ بقر عید کی قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ رکھو۔ اب تم کو اختیار ہے۔ میں نے تم کو روک دیا تھا کہ مشک کے سوا کسی اور برتن میں نبیذ نہ رکھو۔ اب تم دوسرے برتنوں میں بھی رکھ سکتے ہو اور پی سکتے ہو۔ ہاں مگر کوئی اور نشہ آور چیز نہ پیو۔

اسکے بعد مودودی صاحب نے اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا،

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کے احکام میں حالات و مصالح کے مطابق تبدیلی کی

جا سکتی ہے۔

یہی بات جب طلوعِ اسلام کہتا ہے تو مودودی صاحب اسے منکرِ رسالت قرار دے کر گردن زدنی ٹھہرا دیتے ہیں۔ لیکن وہی بات خود کہتے ہیں تو وہ دین کی حقیقت بن جاتی ہے۔

لیکن طلوعِ اسلام اور مودودی صاحب میں ایک فرق ہے۔ طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ بربنائے مصلحت شریعت کے احکام میں تبدیلی کا حق کسی فرد کو نہیں پہنچتا۔ اس کا فیصلہ صرف اسلامی حکومت کر سکتی ہے (جسے اصطلاح میں خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہا جاتا ہے) لیکن مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ نہیں! اس کا فیصلہ "مزاج شناسِ رسول" کرے گا۔

اور یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ "مزاج شناسِ رسول" خود مودودی صاحب ہیں! بس یہ ہے طلوعِ اسلام کا وہ جرم جس کی بنا پر اس پر کفر و ارتداد کے فتوے لگتے ہیں۔ ؎

میری نگاہِ شوق پر اِس درجہ سختیاں
اپنی نگاہِ ناز کی کچھ بھی خبر نہیں!!

"صالحین" کے کارنامے

پچھلے دنوں جب حکومت کی طرف سے وہ کرنسی نوٹ جاری ہوا جس پر قائداعظمؒ کی تصویر چھپی ہے تو جماعتِ اسلامی کی طرف سے حسبِ معمول شور مچا دیا گیا کہ شریعت کی رُو سے تصویر اتروانا اور شائع کرنا حرام ہے۔ اس پر بعض اخبارات کے حصہ مراسلات میں کچھ خطوط شائع ہوئے جن میں کہا گیا کہ خود مودودی صاحب اپنی تصویر اترواتے ہیں۔ اور اس جماعت کے جرائد میں تصاویر شائع ہوتی ہیں۔ اسی سلسلہ میں اب کچھ اور راز ہائے درونِ پردہ سامنے آئے ہیں جو بڑے دلچسپ ہیں۔ بات یوں ہوئی کہ جماعت اسلامی کے ایک ترجمان نے، اس جماعت سے الگ ہو جانے والوں کے خلاف کچھ الزامات لگائے۔ ان میں ایک الزام تصویر کی اشاعت کا بھی تھا۔ اس کا جواب 'ہفتہ وار المنبر کی ۷، ۱۴ اکتوبر کی مشترکہ اشاعت میں' ان الفاظ میں دیا گیا ہے۔

الف۔ آپ مرکزی جماعت سے معلوم کیجئے کہ کیا کبھی کراچی سے کوئی انگریزی ہفت روزہ 'جمعیت طلبا' کے کارکنوں کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ اس پر مرکزی بیت المال کے دس ہزار روپے صرف ہوتے تھے؟؟ ــــ اور اس میں "غیر اسلامی تصاویر" شائع ہوا

کرتی تھیں ؟

(ب) کیا کبھی جماعت کے عظیم تر رہنما نے یہ تجویز مرکزی شوریٰ میں رکھی تھی کہ پاکستان کے خلاف حکمران کے دورۂ امریکہ کی تصاویر کا البم جماعت اسلامی اپنے اہتمام سے شائع کرے اور اسے انتخابی مہم میں استعمال کرے (ٹھیک اسی طرح جس طرح امان اللہ خان مرحوم اور اُن کی ملکہ کے دورۂ امریکہ کی تصاویر بچہ سقہ کے انقلاب کے وقت شائع کی گئی تھیں۔

(ج) کیا یہ درست ہے کہ جماعتِ اسلامی کی صفِ اوّل کے راہ نماؤں کے نیم جماعتی اور ذاتی مجلات اخبارات میں غیر اسلامی تصاویر شائع ہوتی رہی ہیں اور ہو رہی ہیں ؟

(د) کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے بعض کارکنوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے بعض دوروں کی تصاویر کے البم بنائے ہوں اور ان البموں کی تفصیلات مرکزی شوریٰ میں زیرِ بحث بھی آئی ہوں۔ اور اس کے باوجود بھی جماعت اسلامی کے مرکز یا امیر نے ان کارکنوں کو اس فعل سے نہ روکا ہو۔

خود امیر جماعت کا کردار؟

اسی سلسلہ میں خود امیر جماعت (سید ابوالاعلیٰ مودودی) کے کردار کے متعلق بھی ایک بات سن لیجئے۔ جو اسی اخبار کی ۱۸ اکتوبر کی اشاعت میں منظرِ عام پر لائی گئی ہے۔ تحریر ہے :-

> ۵۶ء کی معرکۃ الآرا شوریٰ جماعت اسلامی جس میں جائزہ کمیٹی کی "رپورٹ" زیرِ بحث آئی اس رپورٹ میں متعدد ارکانِ جماعت کی جانب سے یہ الزام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر لگایا گیا تھا کہ مولانا مودودی نے تحریک اسلامی کے محرکِ اول اور جماعتِ اسلامی کے بانی و امیر کی حیثیت سے یہ تصور پیش کیا تھا کہ موجودہ تعلیم گاہیں "قتل گاہیں" ہیں، اس لئے ان میں اپنے بچوں کو داخل کرنا، انہیں قتل کر دینے کے مترادف ہے —— چنانچہ مولانا کی اس زور دار تنقید سے متاثر ہو کر جماعتِ اسلامی کے متعدد کارکنوں اور ارکان نے اپنی اولاد کو مروجہ تعلیم سے محروم رکھا۔ اور ان میں سے بعض ایسے افراد بھی تھے جن کی اولاد کا اس تعلیم سے محروم رہ جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو اپنی برادری میں "نکو" بنا دیں اور ان کے رشتوں ناطوں تک کا معاملہ مخدوش ہو کر رہ جائے۔ لیکن تعجب ہے کہ اس تنقید اور مسلمانوں کو موجودہ تعلیم گاہوں سے اپنی اولادوں کو اٹھا لینے کی دعوت کے بعد خود امیر جماعت نے اپنے لڑکوں کو انہی کالجوں میں داخل کرایا —— یہی اقدام ناقابلِ تصور تھا۔ مگر جب ارکانِ جماعت نے یہ سنا کہ مولانا مودودی صاحب

نے اپنی بچیوں کو بھی کالجوں میں داخل کرا دیا ہے تو ارکانِ جماعت کی مایوسی کی انتہا نہ رہی کہ اگر خود داعی ہی اپنی دعوت کے پرخچے اڑانے لگے تو اس کی حفاظت کون کرے گا۔

جب یہ سوال مرکزی شوریٰ کے زیرِ بحث آیا اور ارکانِ شوریٰ اس پر اظہارِ رائے کر چکے، تو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس الزام کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ——" میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک ظالم باپ بننے اور ایک داعی کی حیثیت سے اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھنے کا، اور دوسرا راستہ اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا — اگر میں اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھتا تو خود میری اولاد مجھے "ظالم باپ" کہتی۔ اس صورت میں بعض لوگوں کے تصور کے مطابق داعی کی حیثیت سے اپنی بات پر عمل پیرا تو ہو جاتا مگر ظالم باپ " ضرور بنتا۔ اور اپنی اولاد کو پست معیار اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتا اور جہاں تک بس چلتا اس کی اخلاقی تربیت کا اہتمام کرتا۔ سو میں نے اسی کو ترجیح دی "۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اس جواب کا ردِ عمل شوریٰ میں کیا ہوا؟ یہاں اس کا ذکر غیر ضروری ہے۔ غرض صرف یہ کرنا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے ایسے کارکن جو دوسروں کے تنکوں پر بحث ہی نہیں کرتے، ان پر تبرے بھی برسانے ہیں، وہ اپنے شہتیروں کو کیوں نظر انداز کئے ہوتے ہیں؟ کیا وہ مولانا مودودی صاحب کے اس " اسوہ " سے بے خبر ہیں؟

اکثر لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ جب مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی شریعت گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی رہتی ہے۔ آج جو چیز خلافِ اسلام ہے کل وہی (ان کی مصلحت کے تابع) عین مطابق دین بن جاتی ہے۔ یہ ہر روز گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہتے ہیں اور انکے ذاتی کردار کا یہ عالم ہے۔ تو پھر اتنے لوگ ان سے وابستہ کیوں ہیں؟ اسکا جواب بھی المنبر کی اسی اشاعت میں واکرده ایک راز سے مل جاتا ہے۔ اس میں معترض کو جاننے ہوتے) لکھا ہے۔

ان دنوں کا علم تو آپ کو ہوگا۔ ۱۹۵۶ء تک کے اعداد و شمار ہمارے پاس بھی کہیں نہ کہیں لکھے ہونگے اسوقت ارکانِ جماعت کی کل تعداد (۱۳۰۰) کے قریب تھی اور فارغ، یعنی تنخواہ پر کام کرنے والے ارکان کی تعداد (۱۲۰) کے لگ بھگ تھی۔ یعنی ہر گیارہواں رکن بیت المال سے معاوضہ لیتا اور تنخواہ دار تھا۔

یہ ہے وہ ٹولہ جو اقامتِ دین کا ڈھول پیٹ پیٹ کر، سادہ لوح مسلمانوں کو اس تنگ راہ کی طرف گھیر گھیر کر لا رہا ہے۔ اس زر و سیم کے دریا کو (جس کا منبع نہ معلوم کہاں ہے) روک دیجئے۔ یہ جماعت خود بخود ختم ہو جائے گی۔

***

نقد و نظر

کتاب اسلامیات

حکومت نے جب، اعلیٰ کلاسوں کے لئے اسلامیات کو لازمی مضمون قرار دینے کا فیصلہ کیا تھا تو ہم نے لکھا تھا کہ ایسا فیصلہ کر دینا تو بہت آسان ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اسلامیات کا نصاب کیا ہوگا اور اس کے لئے کتابیں کس قسم کی مرتب کی جائیں گی. کیونکہ تجربہ نے بتایا یہ ہے کہ جس قسم کی اسلام کی تعلیم اس وقت عام طور پر دی جاتی ہے، اس سے ہماری قوم کے نوجوان اسلام کے گرویدہ ہونے کے بجائے مذہب گزیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ اب ویسٹ پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ کی طرف سے، سیکنڈری کلاسز کے لئے اسلامیات کی کتاب (بطور لازمی مضمون) شائع ہوئی ہے. (سیکنڈری کلاسز سے مراد ہیں نویں اور دسویں جماعتیں) اس کتاب کے مصنفین ہیں خواجہ عبدالحیٔ فاروقی (مرحوم) اور علامہ علاؤ الدین صدیقی. (کتاب پر ان کے اسم گرامی کے ساتھ "علاّ" لکھا ہوا ہے)۔ انہوں نے اس پر نظرِ ثانی بھی کی ہے. کتاب کے باب اول میں قرآن کریم کے آخری پارہ کی آخری پندرہ سورتیں (مع ترجمہ اور تشریح) دی گئی ہیں. باب دوم میں پچیس احادیث مع ترجمہ اور تشریح. باب سوم سیرۃ النبیؐ پر مشتمل ہے اور باب چہارم کا عنوان اسلامی تعلیمات ہے۔

یہ کتاب، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، نویں اور دسویں جماعت کے طالب علموں کے لئے ہے. ان بچوں کی ذہنی سطح کو پیشِ نظر رکھیئے اور پھر اس کتاب میں درج شدہ چند امور پر غور کیجئے اور سوچئے کہ یہ بچے انہیں کیا سمجھیں گے اور ان سے کیا نتیجہ اخذ کریں گے. مثلاً:

(۱) سورۃ والعصر کی تشریح کے سلسلہ میں لفظ (خُسْرٍ) کے سامنے لکھا ہے "خسارہ اور نقصان" — یہ خسارہ جسمانی اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے، اخلاقی لحاظ سے بھی اور روحانی اعتبار سے بھی — اول تو بچے یہی پوچھیں گے کہ جو لوگ "ایمان اور اعمالِ صالح" والے نہیں ہوتے، انہیں جسمانی خسارہ کیا ہوتا ہے؟

پھر اخلاقی خسارہ" کی بات تو سمجھ میں آجاتی ہے لیکن "روحانی خسارہ" کیا ہوتا ہے، اس کا جواب بچوں کو کیا دیا جا سکتا ہے؟ استاد تو ایک طرف کیا کتاب کے مصنف (علامہ صاحب) یہ بتا سکیں گے کہ اخلاق سے الگ روحانیت کیا ہوتی ہے؟ قرآن کریم نے تو خود نبی اکرمؐ کے متعلق بھی یہی کہا ہے کہ آپ "خلقِ عظیم" (بلند ترین اخلاق) کے حامل تھے۔ آپ کی "روحانی ترقی" کا کہیں ذکر نہیں۔ تا بہ دیگراں چہ رسد۔

(۲) سورۃ الفیل کی تشریح کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ ابرہہ کی فوج پر "بے شمار پرندے اپنی چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں لے کر نمودار ہوئے اور اس لشکر پر انہوں نے اس قدر پتھراؤ کیا کہ حملہ آور تباہ و برباد ہوگئے"۔ اس سے لازماً بچے یہ پوچھیں گے کہ پرندوں کی چونچ اور پنجوں کی کنکریوں سے لشکر کس طرح تباہ ہوگیا، تو معلوم استاد بیچارہ انہیں کیا سمجھائے گا؟ اُسے لامحالہ کہنا پڑے گا کہ یہ معجزہ تھا۔ اس سے معجزات کے سلسلہ میں جو الجھاؤ ان بچوں کے ذہن میں پیدا ہوگا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۳) سورۃ الکوثر میں، الکوثر کے متعلق لکھا ہے: حوضِ کوثر۔ جنت کی وہ نہر جس میں آپؐ قیامت کے دن پیاسی امت کو سیراب کریں گے"۔ اس سے "جنت" کا جو تصور بچوں کے ذہن میں جاگزین ہوگا وہ ظاہر ہے۔

(۴) سورۃ النصر میں وَاسْتَغْفِرْهُ ــــ کی تشریح میں لکھا ہے: (اور اس سے بخشش مانگ) دوسرا کام یہ ہے کہ لغزشوں اور کوتاہیوں کے لئے اس کی جناب سے مغفرت اور بخشش کی التجا کی جائے۔ نبی گناہوں سے پاک اور خطاؤں سے معصوم ہوتے ہیں۔ ان کی تمام تر التجائیں اور دعائیں امت کی خاطر ہوتی ہیں۔ قائد یا راہ نما کی حیثیت سے اپنی جماعت کی کمزوریوں کے لئے ان کا یوں دعائیں کرنا حکمت کے عین مطابق ہوتا ہے۔"

اول تو بچوں کی سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آئے گی کہ امت کی خطاؤں کی بخشش کے لئے نبی کے دعا مانگنے سے کیا مطلب ہے؟ پھر اس سے اگلی بات یہ کہ بچوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جائے گی کہ دعاؤں، اور التجاؤں سے خطاؤں اور لغزشوں کی بخشش ہو جاتی ہے۔ یعنی ایک طرف تو ہم انہیں یہ بتائیں گے کہ جس کسی نے امتحان میں "نقل ماری" وہ کمرۂ امتحان سے باہر نکال دیا جائے گا اور اُسے سخت سزا ملے گی۔ اور دوسری طرف ان سے یہ کہیں گے کہ اس قسم کی خطا کے بعد اگر خدا سے دعا مانگ لی جائے، تو پھر کچھ نہیں بگڑے گا۔

"استغفار" کے غلط مفہوم سے کس کس قسم کی تباہیاں لائی جاتی ہیں؟

(۵) سورۃ الفلق میں نَفّٰثٰتِ کی تشریح میں لکھا ہے۔ "عرب میں یہودی عورتیں عام طور پر جادو کیا کرتی تھیں۔ وہ دھاگوں کے گنڈے بنائیں اور ان کی گرہوں میں پھونکیں مار کر جادو کرتیں اور اس طرح بہت سی خرابیاں کھڑی کر دیتی تھیں۔ اس قسم کے جادو اور جادوگروں سے بھی بچنے کی بہت ضرورت ہے۔" اس سے بچوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جائے گی کہ جادو فی الواقعہ اثر انگیز ہوتا ہے۔ اس سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے بچنے کی بہت ضرورت ہے۔ پھر وہ استاذ سے جادو سے بچنے کا طریقہ پوچھیں گے۔ اور وہ غالباً بتائیگا کہ اس کے لئے مولوی صاحب سے تعویذ لے لینا چاہیئے۔ یا فلاں آیت پڑھ کر اپنے آپ کو پھونک لینا چاہیئے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ علم اور روشنی کے اس زمانے میں، پاکستان کی درسگاہوں سے کس قسم کی قوم تیار کر کے نکالی جائے گی؟

(۶) سورۃ الناس کی تشریح میں لکھا ہے۔ "جب سب لوگوں کا رب بھی وہی ہے، مالک بھی وہی ہے اور معبود بھی وہی ہے۔ تو پناہ بھی اسی کی لینی چاہیئے۔ اور اسی کی پناہ میں امن کی امید بھی رکھنی چاہیئے۔" سوال یہ پیدا ہوگا کہ خدا کی پناہ لینے سے مطلب کیا ہے اور یہ کس طرح لی جائے گی؟ معلوم نہیں استاد اس کا جواب بچوں کو کیا دے گا؟

یہ ہے قرآن کریم کی وہ تعلیم جو بچوں کو دی جائے گی اور جس کا حاصل کرنا ان کے لئے لازمی ہوگا۔ "لازمی" کے معنے یہ ہیں کہ اگر کسی بچے نے امتحان میں لکھ دیا کہ جادو، دورِ جہالت کی توہم پرستی کا نام ہے۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ تو وہ اسلامیات میں فیل ہو جائے گا اور چونکہ اسلامیات لازمی مضمون ہے، اس میں فیل ہونے والا امتحان میں فیل سمجھا جائے گا۔

غنیمت ہے کہ احادیث کے انتخاب میں سمجھ سوچ سے کام لیا گیا ہے۔ اور انہیں روزمرہ کے اخلاقی معاملات تک محدود رکھا گیا ہے۔ اگرچہ ان میں بھی بعض مقامات پر اس قسم کی باتیں ملتی ہیں۔ مثلاً حج کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ وہاں حاجی "شیطان کے ستونوں پر کنکریاں مارتے ہیں"۔ —— بچے کیا سمجھیں گے کہ شیطان کے ستون کیا ہوتے ہیں، اور ان پر کنکریاں کیوں ماری جاتی ہیں۔ بچے تو ایک طرف، یہ بات بوڑھے حاجیوں تک کی بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم یہ کیا کر رہے ہیں۔ یا یہ کہ

رسول اللہؐ نے یہ بھی فرمایا کہ حج کرنے کے بعد آدمی گناہوں سے یوں پاک ہو جاتا ہے جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے معصوم پیدا ہوا ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک وضعی روایت نے گناہوں کے لئے کیسا کھلا لائسنس دے دیا ہے۔ ہم عیسائیوں کے معافی ناموں (INDULGENCES) کا مذاق اڑایا کرتے ہیں، کہ ان کی رُو سے چند ٹکوں کے عوض بڑے سے بڑے گناہ کی معافی کا سارٹیفکیٹ مل جاتا تھا۔ اور اپنے ہاں نہیں سوچتے کہ اس قسم کی وضعی روایات کی رُو سے کس طرح ہزار ڈیڑھ ہزار روپے کے عوض، عمر بھر کے سارے گناہوں سے معافی کا سارٹیفکیٹ مل جاتا ہے۔

اور یہ بات ہم بچوں کے کان میں ڈال رہے ہیں!

نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے سلسلہ میں اس قسم کی باتیں بھی کتاب میں درج ہیں۔ مثلاً:

> آپؐ مکہ کے قریب ایک پہاڑ کے غار میں جس کا نام حراؔ ہے چلے جاتے اور صبح شام خدا کی عبادت میں لگے رہتے۔ سوچ بچار اور عبادت کا یہ سلسلہ کئی سالوں تک جاری رہا۔ آپ ستو، کھجور وغیرہ کی صورت میں کئی دنوں کی خوراک ساتھ لے جاتے اور عبادت میں مصروف رہتے۔ جب خوراک ختم ہو جاتی تو گھر آتے ۔ عزیز و اقارب کی خیر خیریت پوچھ کر اور خوراک ساتھ لے کر پھر حرا میں تشریف لیجاتے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے کس طرح، فقیروں، سادھوؤں کا سا تصور ذہن میں آجاتا ہے جو جنگلوں پہاڑوں، اور غاروں میں چلہ کشی کرتے ہیں۔ گویا حضورؐ نے بھی یہی طریقہ اختیار فرمایا تھا اور اس سے آپؐ کو نبوت مل گئی تھی۔

(۲) پہلی وحی کے بعد، وہ مشہور روایت درج کر دی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ حضورؐ گھبرا کر گھر تشریف لائے۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دلائی اور اپنے چچا زاد بھائی ’ورقہ بن نوفل‘ کے پاس لے گئیں جو عیسائی عالم تھے۔ اس نے آپ کو تسلی دی اور بتایا کہ آپ کو نبوت ملی ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ اے کاش! میں اس وقت زندہ ہوتا جب قوم آپ کو یہاں سے نکال دے گی تو میں آپ کا ساتھ دیتا۔ اس کے بعد کتاب میں لکھا ہے۔

> ورقہ کی گواہی کے بعد حضورؐ آئندہ کے کٹھن کام کے لئے اپنے آپ کو تیار پانے لگے۔

معاذ اللہ۔ معاذ اللہ۔ ایک ایسی برگزیدہ ہستی جسے خدا نے منصبِ نبوت کے لئے منتخب کیا۔ اسے تو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اور ایک عیسائی عالم نے بتایا کہ یہ وحی ہے جو آپ پر نازل ہوئی ہے اس کی گواہی پر آپؐ نے اپنے آپ کو خدا کا رسول سمجھ لیا۔ پھر تماشہ یہ کہ اس یقین کے بعد بھی ورقہ بن نوفل

آپ کی رسالت پر ایمان نہ لایا اور اس حسرت میں مر گیا کہ جب قوم آپؐ کو مکہ سے نکالے گی، اے کاش! میں اس وقت زندہ ہوتا تو آپؐ کا ساتھ دیتا۔

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ اگر کوئی مخالف یہ کہے کہ ورقہ بن نوفل کے ایمان نہ لانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آپؐ کو فی الحقیقت رسول نہیں مانتا تھا۔ اس نے (معاذ اللہ) محض بہکانے کی خاطر ایسا کہہ دیا اور آپؐ نے اُسے سچ مان لیا ــــ تو اس کا ہمارے پاس کیا جواب ہے! اس سے بچوں کے ذہن میں جو سوالات ابھریں گے۔ ان کا کوئی مداوا بھی سوچا گیا ہے!

(۳) واقعہ معراج (عام روایات کے مطابق) لکھنے کے بعد، تحریر ہے۔

معراج کا واقعہ سیدھا سادا ہے اور بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ مگر جو نہ سمجھنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہوں بھلا اُنہیں کون سمجھائے۔ علامہ اقبالؒ نے معراج کا فلسفہ یوں بیان کیا ہے ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰےؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

ہم شکر گذار ہوں گے، اگر کتاب کے مصنف (علامہ صدیقی صاحب) اس سیدھے سادے واقعہ کو، قوم کو سمجھا دیں۔ (اس کے لئے طلوعِ اسلام کے صفحات حاضر ہیں) اس لئے کہ امت آج تک اس سوال پر بھی متفق نہیں ہو سکی کہ معراج کا واقعہ خواب میں پیش آیا تھا یا عالمِ بیداری میں　حضورؐ بہ جسدِ عنصری آسمانوں پر تشریف لے گئے تھے۔ اور اس اختلاف میں، اور تو اور، خود صحابہ کبارؓ بھی شامل ہیں۔ امت پر یہ کتنا بڑا احسان ہوگا، اگر علامہ صاحب اس مسئلہ کو حل فرما دیں۔

تعلیمات کے سلسلہ میں اس قسم کی باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں:۔

قرآن مجید میں حلال و حرام کی تفصیل پوری طرح موجود ہے۔ مثلاً جو جانور حلال ہیں یا وہ جانور جو حرام ہیں، ان کی فہرست جا بجا درج ہے۔

"جا بجا" کو چھوڑیئے۔ کیا مصنف کتاب، قرآن کریم کے کسی ایک ایسے مقام کی نشاندہی کریں گے جہاں حلال اور حرام جانوروں کی پوری پوری فہرست دی گئی ہو؟

(۵) کتاب میں، حضرات انبیاء کرامؑ کی فہرست میں حضرت عزیرؑ کا نام بھی درج ہے ــــ کیا جناب مصنف فرمائیں گے کہ قرآن کریم نے، "عزیر" کو کس جگہ نبی کہا ہے۔؟

اسلام کے متعلق کتاب میں لکھا ہے۔

اسلام دنیا کے اندر ایک عالمگیر برادری اور کامل مساوات چاہتا ہے۔ یہ بات اُس وقت حاصل ہوگی جب دنیا کی تمام قومیں اسلام کے کلمہ پر جمع ہو جائیں گی اور حضرت محمدؐ کو اپنا ہادی مان لیں گی۔ اور ان کی ہدایت پر عمل پیرا ہو جائیں گی۔

بچے یہ پوچھیں گے کہ دنیا کی ساری قومیں اسلام کے کلمہ پر جب جمع ہوں گی' اسے تو چھوڑیئے۔ اسوقت دنیا میں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان موجود ہیں جو اسلام کے کلمہ پر جمع ہیں۔ کیا یہ ایک عالمگیر برادری بن چکے ہیں اور ان میں کامل مساوات پیدا ہو چکی ہے؟ اسکا غالباً یہ جواب دیا جائے گا کہ مسلمان' اسلام کی ہدایات پر عمل پیرا نہیں! تو وہ پوچھیں گے کہ کیا دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسے مسلمان نہیں جو اسلام کی ہدایات پر عمل پیرا ہیں؟ اگر کوئی بھی نہیں تو پھر یہ مسلمان کس طرح ہیں؟ اور اگر کہیں کوئی ایسے مسلمان ہیں تو کیا ان میں کامل مساوات ہے؟ معلوم نہیں ان سوالات کا کیا جواب دیا جا سکے گا۔

یہ ہیں چند ایک نکات اس کتاب کے جو اسلامیات کے لئے بطور نصاب تجویز ہوئی ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں علامہ صاحب نے لکھا ہے۔

پاکستان بالخصوص بلکہ پوری دنیائے اسلام میں علوم اسلامیہ کی اہمیت روزِ روشن کی طرح واضح ہے کیونکہ یہی وہ رشتہ ہے جو مسلمانانِ عالم کو ایک دوسرے کا بھائی اور ہمدرد و غمخوار بناتا ہے۔۔۔۔ دعا ہے کہ ہمارے طلبہ لازمی اسلامیات سے واقفیت حاصل کر کے اور اس پر عمل پیرا ہو کر سچے مسلم مومن شہری بنیں۔ آمین!

اسلامیات کی اہمیت سے کسے انکار ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جو اسلامیات اس کتاب میں پیش کی گئی ہے کیا اس سے مسلمانانِ عالم ایک دوسرے کے بھائی، ہمدرد اور غمخوار اور اس سے واقفیت حاصل کر کے طلبہ "سچے مسلم مومن شہری" بن جائیں گے؟ اگر ایسا ہو جائے تو یہ معجزہ ہوگا! کیا اس کتاب میں اور اسلامیات سے متعلق ان کتابوں میں جو انگریز کے عہدِ غلامی میں ہمارے اسلامیہ سکولوں میں پڑھائی جاتی تھیں' کچھ بھی فرق ہے؟ اگر فرق نہیں تو پھر ہماری عہدِ غلامی کی تعلیم اور آزاد مملکتِ پاکستان کی تعلیم میں کیا فرق ہے؟ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام وہ نظامِ زندگی ہے جو نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے اور دنیا کا کوئی اور نظام اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیا اسلامیات کی اس قسم کی تعلیم سے' اُس اسلام کی کوئی ادنیٰ سی جھلک بھی طلباء کے سامنے آ سکتی ہے؟ اگر ایسا نہیں تو پھر اسکا گلہ کیا، کہ ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کے لئے کوئی کشش و جاذبیت اپنے اندر نہیں پاتا؟

مُفسِدین کا انجام

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

پرویز

اصلاح اور فساد، قرآن کریم کی دو اہم اصطلاحات ہیں اور ایک دوسرے کی ضد۔ ہمارے ہاں، فساد کا لفظ، دنگہ فساد یا لڑائی جھگڑے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور "صلح" کا لفظ، صلح صفائی" کے لئے، اور اصلاح، ریفارم کے معنوں میں۔ لیکن (عربی زبان اور) قرآن کریم میں یہ اصطلاحات، ان سے کہیں زیادہ وسیع معانی میں استعمال ہوتی ہیں۔ صلح کے بنیادی معنی ہوتے ہیں "جس چیز کو جس حال میں ہونا چاہیئے، اُسے ٹھیک اسی حال میں ہونا" چنانچہ معاشرہ کی ناہمواریاں دور ہو جانے اور افراد کی صلاحیتوں کے مناسب نشو و نما پا لینے کے لئے بھی یہی الفاظ آتے ہیں۔ اعمالِ صالحہ، ان کاموں کو کہتے ہیں جن سے حسن کائنات میں نکھار پیدا ہو، جن سے معاشرہ کے بگڑے ہوتے کام سنور جائیں۔ اور انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نشو و نما ہو جاتے۔ فساد اس کی ضد ہے جس کے معنی ہیں، بگاڑ پیدا ہونا۔ توازن بگڑنا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کے پرکھنے کا معیار کیا ہے کہ ایک چیز کو جس حالت میں ہونا چاہیئے وہ اس حالت میں ہے یا نہیں۔ طبیعی اشیاء (PHYSICAL THINGS) کے متعلق یہ معلوم (یا طے) کرنا آسان ہے کہ جس شئے کو جس حالت میں ہونا چاہیئے وہ اس حالت میں ہے یا نہیں۔ معمل (یعنی لیبارٹری) کا ٹسٹ، اس کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ لیکن انسانوں کی اخلاقی اور تمدنی دنیا میں اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی مفسد اس کا اقرار و اعتراف نہیں کرتا کہ وہ فساد پیدا

کر رہا ہے۔ اس کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ وہ مصلح (اصلاح کرنے والا ہے) چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِۙ قَالُوۡاۤ اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ۔ (۲/۱۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں فساد مت برپا کرو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم فساد کب برپا کرتے ہیں) ہم تو مصلح ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بدنیتی سے فساد کو اصلاح سے تعبیر نہ کرتا ہو بلکہ نہایت نیک نیتی سے فساد کو اصلاح سمجھ کر اس کے لئے کوشاں ہو۔ لیکن نتیجہ بہرحال دونوں صورتوں میں ایک ہی مرتب ہوگا ـــ لہٰذا، اس چیز کو لوگوں کے انفرادی فیصلے پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے لئے کوئی خارجی معیار (OBJECTIVE STANDARD) ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے حسبِ معمول، ہماری توجہ خارجی کائنات کے نظم و نسق کی طرف مبذول کرائی ہے اور کہا ہے، کہ تم دیکھتے ہو کہ کارگہِ کائنات کس طرح ٹھیک ٹھیک چل رہا ہے۔ اس میں ہر شے ویسی ہی ہوتی ہے جیسی اُسے ہونا چاہیئے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ آج بارش کے پانی کے اجزاء کچھ اور ہوں اور کل وہ کچھ اور ہو جائیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ جَو کے بیج سے گندم پیدا ہو جائے اور گندم کے بیج سے جَو ـــ سورج کبھی کہیں سے طلوع ہونا شروع ہو جائے اور کبھی کہیں سے، چاندنی کا رنگ آج کچھ اور ہو اور کل کچھ اور۔ کبھی خزاں میں پھول کھلنے لگ جائیں اور بہار میں مرجھا جائیں۔ ـــ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ

(۱) کائنات میں صرف ایک خدا کا قانون نافذ العمل ہے کسی اور کا نہیں ـــ اسے سائنس کی اصطلاح میں (LAW OF UNIFORMITY OF NATURE) کہتے ہیں ـــ اور

(۲) ہر شے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ وہ قانون کو اپنی مرضی کے تابع نہیں رکھتی۔

اول الذکر کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ

لَوۡ كَانَ فِيۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۔ (۲۱/۲۲)

اگر ارض و سما (کائنات) میں خدا کے علاوہ کوئی اور صاحب اقتدار بھی ہوتا، تو اس میں فساد برپا ہو جاتا۔

اور ثانی الذکر کے سلسلہ میں کہا کہ

وَلَوِ اتَّبَعَ الۡحَـقُّ اَهۡوَآءَهُمۡ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ وَ

مَنْ فِيهِنَّ ۔ (۲۳/۷۱)

اگر حق (قانونِ محکم) ان کی مرضی کے تابع ہو جاتے، تو ساری کائنات میں فساد برپا ہو جاتے۔

یعنے فساد (بگاڑ) سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ (۱) قانون ایسا ہو جو کسی کی خواہش، مرضی، آرزو یا مفاد کے تابع نہ ہو — اور (۲) ہر ایک اس قانون کا اتباع کرے۔ خارجی کائنات کا نظام اسی پروگرام کے مطابق چل رہا ہے۔ اس میں جو قانون کارفرما ہے۔ وہ نہ تو اشیائے کائنات کا اپنا پیدا کردہ ہے اور نہ ہی کسی کی خواہش کے مطابق اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ہر شے اس قانون کے مطابق چلنے پر مجبور ہے — وَ (هُمْ) لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۔ (۲۱/۱۹)

جہاں تک انسانوں کی تمدنی دنیا کا تعلق ہے، اس کے لئے بھی اُسی خدا نے قوانین مقرر کر دیئے ہیں جس نے اشیائے کائنات کے لئے قوانین مرتب کئے ہیں۔ لیکن انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں ایک بنیادی فرق ہے (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اشیائے کائنات، متعلقہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور پیدا کی گئی ہیں، لیکن انسان کو اس باب میں صاحبِ اختیار وارادہ بنایا گیا ہے۔ مشیت چاہتی یہ ہے کہ جو کچھ اشیائے کائنات مجبوراً کرتی ہیں، انسان وہی کچھ (یعنے قوانین خداوندی کا اتباع) اپنے اختیار وارادے سے کرے، کہ اسی سے اس کی ذات کی نشوونما اور شرفِ انسانیت کی بالیدگی ہوتی ہے

لیکن انسان اپنے اختیار وارادے کا استعمال غلط کرتا ہے اور اسی سے وہ تمام فساد پیدا ہوتا ہے، جو اس کی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔ یہ اپنے لئے آپ قوانین وضع کرتا ہے اور پھر تماشا یہ کہ ان قوانین کا بھی کما حقہ اتباع نہیں کرتا۔ ان سے بچنے کے لئے ہزار گریز کی راہیں نکالتا اور لاکھ حربے تراشتا ہے — انسان کی یہی وہ ذہنیت (اور روش) ہے جسے قرآن کریم نے قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں بایں حسن و خوبی بیان کیا ہے۔ ملائکہ اس جدید مخلوق کے ہیولائے آب و گل کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (۲/۳۰) اسے با اختیار بنایا جا رہا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ زمین میں فساد برپا کرے گا، اور خون بہائے گا — کہا کہ ٹھیک ہے۔ اگر اسے علیٰ حالہ چھوڑ دیا گیا تو یہ ایسا ہی کرے گا۔ لیکن ہم اسے خود قوانین زندگی مرتب کر کے دیں گے — (فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى) یہ اگر ان قوانین کا اتباع کرے گا تو پھر یہ حالت نہیں ہوگی — فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔ (۲/۳۸) جو ان قوانین کا اتباع کرے گا تو ایسے لوگوں کو نہ خوف ہوگا نہ حزن، ان کی تمدنی زندگی فساد انگیزیوں سے مامون اور خون ریزیوں سے محفوظ رہے گی۔ اس کا نام اصلاح

ہے۔ اور اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ فساد۔۔۔۔ اسی لئے تاکید کی گئی کہ ۔ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۔ جب تمہاری تمدنی زندگی بہ حالتِ اصلاح ہو تو اس میں فساد مت پیدا کرو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ۔ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۔ (۷/۵۶) ۔ دفعِ مضرت مقصود ہو، یا جلبِ منفعت (کسی کے نقصان سے بچنا چاہو، یا کوئی فائدہ حاصل کرنا ۔۔۔ دونوں صورتوں میں) قانونِ خداوندی کو آواز دیا کرو، اور اس کے مطابق قدم اٹھایا کرو۔ تمہاری زندگی فساد سے محفوظ ہو جائے گی۔ اسکے برعکس اگر تم نے اس اصولِ حیات سے انکار کیا اور اس سے سرکشی برتی ۔۔۔۔ خود بھی سرکشی برتی اور دوسرے لوگوں کو بھی اس راستے پر چلنے سے روکا، تو اس سے اس قسم کا فساد پیدا ہو جائے گا جس کی تباہیاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ (۱۶/۸۸)

ان اصولی ہدایات کے بعد قرآن کریم نے محسوس انداز میں بتایا کہ انسانوں کی تمدنی زندگی میں فساد کس کس شکل میں رونما ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس نے فسادِ ملوکیت کو نمایاں طور پر پیش کیا جس کی نمائندگی دنیا کا ہر فرعون کرتا ہے۔ ملوکیت سے مراد ہے ایسا نظامِ مملکت جس میں انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کی جائے (خواہ اس کی عملی شکل ۔۔۔ جلالِ پادشاہی ہو، یا جمہوری تماشا) مفاد ملوکیت کا پہلا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسانی وحدت کو ختم کر کے، انہیں مختلف ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے ۔۔۔۔ وَيَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۔ (۲/۲۷) جس انسانی برادری کو ملا کر رکھنے کا حکم خدا نے دیا تھا وہ اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور اس طرح زمین میں فساد برپا کر دیتے ہیں ۔۔۔ اس کی بدترین شکل، عصرِ حاضر کی قومیت پرستی (نیشنلزم) ہے جس نے (محض نقشوں پر کھینچی ہوئی فرضی اور غیر فطری لکیروں کے مطابق)، عالمگیر انسانیت کو اس طرح مختلف گروہوں میں بانٹ رکھا ہے کہ ایک گروہ، دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا، اور ایک قوم دوسری قوم کی جان کی دشمن بن رہی ہے۔ اس سے اگلا قدم، ایک قوم کے اندر مختلف پارٹیاں بنانا ہے۔ قرآن کریم نے فرعون کے خلاف جو سب سے بڑا جرم عاید کیا ہے، وہ یہی ہے کہ وہ قوم (بنی اسرائیل) کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا۔۔۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ ۔ فرعون نے ملک میں بڑی سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ اُس نے اُدھم مچا رکھا تھا۔ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا ۔ یعنی اُس نے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔۔۔ اس پارٹی بازی سے اس کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ وَيَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ ۔۔۔ وہ اس طرح اس گروہ کو جس سے اسے ذرا خطرہ محسوس ہوتا تھا، کمزور کر دیتا

تھا۔ اس کی عملی شکل یہ تھی کہ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ۔ اس پارٹی کے اُن افراد کو جن میں جوہر مردانگی کی نمود ہوتی، ذلیل و خوار کر دینا اور زنخوں کو آگے بڑھاتا چلا جانا۔ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (۲۸/۴)۔ یہ تھی اس کی فساد انگیزی جس سے اس نے معاشرہ میں اسقدر ناہمواریاں پیدا کر رکھی تھیں۔

اور یہ چیز کسی خاص فرعونی حاکم کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، یہ ملوکانہ حکمتِ عملی ہے، جو ہر زمانے میں اسی طرح کارفرما رہتی ہے۔ چنانچہ سورہ نمل میں، اس حقیقت کو (ملکۂ سبا کی زبانی، ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ۔ (۲۷/۳۴)

یاد رکھو! جب بادشاہ کسی ملک پر چڑھائی کرتے ہیں تو اُسے اُلٹ پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ یعنی وہاں کے صاحبِ عزت اکابرین کو سب سے زیادہ ذلیل و خوار بنا دیتے ہیں۔ اور یہ بات کسی خاص بادشاہ سے متعلق نہیں، ملوکیت میں یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ ہوتا رہے گا۔

ملوکیت کی زندگی کا راز ہی اس میں ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹی رہے، اور اس میں ایسا اتار چڑھاؤ ہوتا رہے کہ کبھی ایک گروہ اوپر آجائے اور کبھی دوسرا۔ اور اس عملِ دولابی میں نکتہ یہ پیشِ نظر رہے کہ جس میں کہیں جوہرِ انسانیت کے آثار محسوس ہوں، اسے کچل کر رکھ دیا جائے اور اپنے گردوپیش انہیں رکھا جائے جن میں اُبھرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ یہ تھی فسادِ آدمیت کی وہ اولین لعنت جسے مٹانے کے لئے آسمانی انقلاب کے داعی (حضرات انبیاء کرامؑ) دنیا میں آتے رہے — اور یہی تھی ان کی وہ انقلابی دعوت جسے ملوکیت کے علمبردار "فساد" سے تعبیر کر کے، کچل دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب صاحب ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ نے اس حکمتِ فرعونی کے خلاف آواز بلند کی تو فرعون کے درباریوں نے اس سے کہا کہ — اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ۔ (۷/۱۲۷)، "کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو اس طرح آزاد چھوڑ دینا چاہتا ہے کہ وہ ملک میں فساد برپا کر دیں۔"

آ بتاؤں تجھ کو سِرّ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْك
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اِک جادوگری! (اقبالؔ)

آپ نے غور فرمایا کہ ملوکیت کے نمائندگان کے نزدیک "اصلاح" کا تصور کیا ہوتا ہے اور "فساد" سے مراد کیا؟ ہر مستبد قوت، معاشرہ میں صحیح اصلاح کو فساد سے تعبیر کر کے، اس کے داعیان کو حوالۂ دار و رسن کر دینا چاہتی ہے۔ یہ ارباب اقتدار کا گروہ ہوتا ہے جسے اس قسم کے صحیح انقلاب میں، اپنی مفاد پرستیوں کی موت نظر آتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرت صالح نے، قوم ثمود کی فساد انگیزیوں کے خلاف، (جن کی تفصیل ذرا آگے چل کر آتے گی) اعلانِ احتجاج کیا تو اس قوم کے ارباب اقتدار کو خطرہ محسوس ہوا ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ۔ (۲۷/۴۸)

دارالسلطنت میں صرف نو بڑے بڑے سردار تھے، جن کے ہاتھ میں زمام اقتدار تھی۔ وہی ان تمام شرارتوں کی جڑ تھے۔ وہ ملک میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے اور قوم کو کبھی اصلاح کی طرف نہیں آنے دیتے تھے۔

چنانچہ

انہوں نے اپنی میٹنگ بلائی اور آپس میں کہا کہ قسم اٹھاؤ کہ ہم سب مل کر صالح اور اس کے ساتھیوں پر رات کے وقت حملہ کریں گے اور پھر ان کے وِرثاء کے سامنے صاف مکر جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہم نے انہیں قتل ہوتے دیکھا تک نہیں اور ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔ (۲۷/۴۹)

یہ تھی فسادِ آدمیت کی پہلی شکل ــــ یعنی بساطِ ملوکیت کی مہرہ بازیاں ــــ اس کی دوسری شکل معاشی ناہمواریاں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم نے بڑی شرح و بسط سے کیا ہے۔ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں اس "جنت کی زندگی" کے متعلق جس میں ہنوز فساد پیدا نہیں ہوا تھا، کہا کہ اس میں کیفیت یہ تھی کہ (كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا۔ (۲/۳۵) ــــ ہر ایک کو، ہر جگہ، سیر ہو کر کھانے کو ملتا تھا ــــ اس میں کسی فرد کو، نہ بھوک کا خوف ستاتا تھا، نہ پیاس کا۔ ــــ نہ لباس کی محتاجی تھی نہ مکان کی (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) ــــ یہ تھی معاشرہ کی وہ حالت جسے فساد نے نہیں چھوا تھا۔ اس کے بعد حقیقت فراموش انسان کی مفاد پرستی نے اس میں فساد پیدا کر دیا تو معاشرہ کی یہ حالت باقی نہ رہی مصلحین انسانیت، حضرات انبیاء کرام آتے رہے، تاکہ معاشرہ کو پھر سے انہی خطوط پر متشکل کریں۔ وہ قوم سے کہتے

یہ سمجھ کر

كُلُوْا — وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۲/۶۰)۔

خدا نے جس قدر سامانِ زیست عطا کیا ہے، اس میں سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کھاؤ پیو۔ اور زمین میں فساد مت برپا کرو — معاشرہ میں ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔

قرآن کریم نے جن اقوام کی سرگذشت بیان کی ہے، ان میں سے قوم ثمود نے اسی قسم کی معاشی ناہمواریاں شدید طور پر پیدا کر رکھی تھیں۔ اُس زمانے کی معیشت گلہ بانی پر مبنی تھی۔ قوم کے ذی قوت طبقہ نے ملک کی چراگاہوں اور چشموں پر اس طرح قبضہ کر رکھا تھا کہ کمزوروں اور غریبوں کے مویشیوں کو نہ کھانے کو چارہ ملتا تھا نہ پینے کو پانی — حضرت صالحؑ اس "فساد" میں اصلاح پیدا کرنے کیلئے اٹھے۔ انہوں نے اُن مستبد سرداروں سے کہا کہ — فَاذْكُرُوْا آلَاءَ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ: (۷/۷۴)۔ — خدا نے تمہیں جن نعماء سے نوازا ہے، انہیں پیشِ نظر رکھو۔ اور ملک میں فساد برپا نہ کرو — معاشی ہمواریاں پیدا کرو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تمام مویشیوں کی باری باندھ لو — خواہ وہ غریبوں کے مویشی ہوں اور خواہ امیروں کے، رزق کی ضرورت تو ہر مویشی کو ہوتی ہے ان کی ضروریات پورا ہونے دو۔

قوم مدین کا معاشی نظام کاروباری تھا۔ اور انہوں نے اس میں بھی فساد پیدا کر رکھا تھا۔ اس فساد کی تشریح، حضرت شعیبؑ کے الفاظ میں یوں بیان ہوئی ہے۔ انہوں نے قوم سے کہا کہ

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا۔ (۷/۸۵)

(تمہیں چاہیئے کہ اپنے معاشی نظام میں عدل سے کام لو) ماپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو۔ اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو۔

قرآن کریم نے مختلف مقامات پر، قوم مدین کی اس فساد انگیزی کا ذکر کیا ہے اور ہر مقام پر اسے انہی الفاظ سے تعبیر کیا ہے (مثلاً ۱۱/۸۵ ، ۲۶/۱۸۲-۱۸۳) — "ماپ تول پورا رکھنے" سے مراد اتنا ہی نہیں کہ ترازو اور باٹ صحیح صحیح رکھو۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ اپنے معاشی نظام کو عدل کی بنیادوں پر استوار کرو۔

معاشی فساد کی بنیاد سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ قرآن کریم نے قارون کو اس ذہنیت کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورۃ قصص میں اس کی "فساد انگیزی" کی تفصیل ان الفاظ میں آئی ہے۔

قارون، قومِ موسیٰؑ ہی کا ایک فرد تھا، کوئی غیر نہیں تھا۔ لیکن اپنی دولت کے بل بوتے پر اپنی قوم کے افراد سے بڑی زیادتی کرتا تھا۔ چنانچہ اسطرح اس کے پاس اس قدر دولت جمع ہو گئی کہ اس کے خزانے کی حفاظت کے لئے ایک طاقتور جماعت کی ضرورت تھی۔

اس دولت کے نشہ نے اُسے مدہوش کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کی قوم کے ہوشمند طبقہ نے اس سے کہا کہ تم اس مال و دولت پر اس قدر اتراؤ نہیں، اس کا نتیجہ خراب ہوگا۔ یہ روش قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدہ نہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ تم مال و دولت کو تیاگ کر تارک الدنیا بن جاؤ۔ ہرگز نہیں۔ ہم کہتے یہ ہیں کہ تم اس سے بھی فائدہ اٹھاؤ۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش مت کرو کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی نہیں جس میں انسان کا منتہائے نگاہ مال و دولت جمع کرنا ہے اور بس۔ زندگی اس سے آگے بھی چلنی ہے۔ اس مال و دولت سے تم اُس زندگی کو بھی خوشگوار بناؤ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح خدا نے تمہاری ہر کمی کو پورا کرکے تمہاری زندگی کو حسین بنا دیا ہے، اسی طرح تم دوسروں کی کمی کو پورا کرکے ان کی زندگی کو بھی حسین بنا دو اور معاشرہ میں فساد (ناہمواریاں) مت پیدا کرو کہ تم امیر سے امیر تر ہوتے جاؤ، اور دوسرے لوگ غریب سے غریب تر ہوتے جائیں۔ اسی کو فساد کہتے ہیں اور فساد پیدا کرنے والوں کو خدا کبھی پسند نہیں کرتا۔

یہ سنکر اُس نے اُن سے کہا کہ تمہیں میرے معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابک دستی سے کمائی ہے، اس لئے اسے جس طرح میرا جی چاہے، صرف کروں۔ اس میں خدا کا کیا دخل ہے اور کسی کو مجھ سے باز پرس کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

اسے کاش! اُسے معلوم ہوتا کہ اس قسم کی ذہنیت نے اس سے پہلے کتنی قوموں کو تباہ کر دیا تھا جو اس سے زیادہ قوت و حشمت کی مالک تھیں اور انہوں نے مال و دولت بھی اس سے کہیں زیادہ جمع کر رکھا تھا۔ خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں تباہ کر دیا۔ ان کے یہ جرائم اس قدر بدیہی اور نمایاں تھے کہ اس کی بھی ضرورت نہ پڑی کہ ان کے متعلق کچھ پوچھ گچھ

کیجائے۔ (نظام سرمایہ داری کی تو بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی تباہی کہیں خارج سے نہیں آیا کرتی۔) (مفہوم القرآن۔ ۲۸/۱۱۲-۱۱۳)

اور فساد کا یہی تباہ کن انجام ہے جس کی طرف قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے ــــ کہیں عمومی حیثیت سے اور کہیں فساد انگیز قوموں کی تباہی کا خصوصی ذکر کر کے ــــ عمومی طور پر کہا کہ

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا یُفْسِدُوْنَ۔ (۱۶/۸۸)

جو لوگ اس صداقت سے خود بھی انکار کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس طرف آنے نہیں دیتے' ان کی تباہیاں دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ اس فساد کا فطری نتیجہ ہوتا ہے جسے وہ معاشرہ میں برپا کرتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں، اس روش کے حاملین کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ ــ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ (۲/۲۷) ان لوگوں کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ سورۂ یونس میں کہا کہ ــــ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ۔ (۱۰/۸۱)۔ یہ یقینی بات ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے ایسا ہو نہیں سکتا کہ معاشرہ میں فساد پیدا کرنے والوں کے کام سنور جائیں۔ یعنے معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو جائے اور جو لوگ اس بگاڑ کے ذمہ دار ہوں' ان کی حالت سنورتی جائے' یہ ناممکن ہے۔ حالت انہی کی سنورے گی جو معاشرہ کو سنوارنے کی کوشش کریں گے۔ سورۂ صٓ میں ہے۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ ... ... (۳۸/۲۸)

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ جو قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں' اور معاشرہ کو سنوارنے والے کام کریں' وہ' اور وہ لوگ جو معاشرہ میں فساد پیدا کریں' دونوں برابر ہو جائیں؟ ایسا ہو نہیں سکتا۔

اس اصولِ محکم کی تبیین کے لئے اس نے کہا کہ تاریخ کے اوراق پر غور کرو اور دیکھو کہ جن اقوام نے اس قسم کی روش اختیار کی تھی' ان کا انجام کیا ہوا؟ ــــ وَ انْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ــ (۷/۸۶) عاد اور ثمود اور فرعون (وغیرہ) نے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کیں ــــ فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ــ (۸۹/۱۳)، تو خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں بری طرح سے تباہ کر دیا۔

یہ تباہی اس وقت آتی ہے جب معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کی روش عام ہو جائے اور

جو لوگ اس پوزیشن میں ہوں کہ اس غلط روش کا سدِ باب کر سکیں وہ بھی لوگوں کو اس سے روکنے کی کوشش نہ کریں ۔۔۔ چنانچہ اقوامِ سابقہ کی سرگذشت بیان کرنے کے بعد، قرآن کریم نے کہا کہ ان اقوام میں سے

> جو لوگ تباہی سے بچ جاتے تھے، ان میں سے بھی بعد میں، معدودے چند ایسے رہ جاتے جو اپنے مفاد کو خدا کے قانون کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور ملک میں لوگوں کو ناہمواریاں پیدا کرنے سے روکتے۔ ورنہ باقیوں کا حال تو یہ ہو جاتا کہ وہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برت کر، اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے جاتے، تاکہ ان کی آسودگیوں اور تن آسانیوں میں فرق نہ آنے پائے (خواہ باقی مخلوق پر کچھ ہی کیوں نہ گذرے) یہ تھے اُن کے جرائم جن کی وجہ سے ان پر تباہی آئی تھی۔ (مفہوم القرآن - ۱۱/۱۱۶)

آپ قرآن کریم کے ان مقامات پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ اس نے فسادِ آدمیت کی جو جو شقیں بتائی ہیں، کیا وہ ہمارے معاشرے میں جمع نہیں ہو رہیں؟ اور اگر یہ حقیقت ہے تو کیا اس اندازِ معاشرت کا حتمی اور یقینی نتیجہ وہی نہیں ہوگا جو اقوامِ سابقہ کے ہاں ہوا تھا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری حالت اِس وقت بعینہٖ ویسی ہی ہو چکی ہے جیسی قومِ مدین کی تھی۔ اس قوم کے متعلق جو کچھ قرآن کریم نے کہا ہے وہ ہر قلبِ حساس کے لئے سامانِ صد ہزار عبرت اپنے اندر رکھتا ہے۔ سورۂ ھود میں ہے۔

> اور اسی طرح ہم نے قومِ مدین کی طرف، ان کے بھائی بند، شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے اُن سے کہا کہ تم (اپنے آئین و رسوم کو چھوڑ کر) صرف خدا کے قوانین کی اطاعت اختیار کر لو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت تو تم بڑے خوش حال ہو، لیکن تم نے اپنے معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس حالت کو بدلو۔ اپنے ناپ تول کے پیمانوں کو پورا رکھو۔ ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تم پر ایسی تباہی آجائے گی جو تم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیگی۔
>
> اے میری قوم کے لوگو! اپنے معاشی نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھو اور کسی کے حق میں کمی نہ کرو۔ ایسا کرو گے تو ملک میں سخت ناہمواریاں (فساد) پیدا ہو جائیں گی

اور معاشرہ تہس نہس ہو جائے گا۔

یاد رکھو! جو کچھ تم اس طرح فریب کاری اور سلب و نہب سے اکٹھا کر لیتے ہو، اگرچہ وہ بظاہر بہت کچھ نظر آتا ہے لیکن وہ تمہارے لئے قطعاً نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ ثبات و دوام فقط ان مفادات کے لئے ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق حاصل کئے جائیں ---- اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ثبات و دوام اُسے حاصل ہو سکتا ہے جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں اس وقت آسکتی ہے جب تم خدا کے قانون کی صداقت کو تسلیم کرو۔ اگر تم اسے تسلیم نہیں کرتے، تو تم سے اسے جبراً نہیں منوایا جا سکتا۔ میرا کام تم تک اس پیغام کو پہنچا دینا تھا۔ میں تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا جو تم سے جبراً یہ کچھ منواؤں۔ (مفہوم القرآن۔ ۱۱/۸۴-۸۶)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں اس سے زیادہ اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک قوم، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں لاتی ---- یعنی اسے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم نہیں کرتی ---- اس کی حالت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی ---- اور جب تک یہ اپنی موجودہ روش میں تبدیلی پیدا نہیں کرتی، یہ تباہی سے بچ نہیں سکتی۔ یہ خدا کا قانون ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔

اور خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

خدا کے چہرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ضرورتِ رشتہ

ایک پنجابی ڈاکٹر (ایم۔ بی۔ بی۔ ایس) سلیقہ شعار۔ بلند خیال۔ ناکتخدا لڑکی کے لئے، تعلیم یافتہ، سلیم الطبع، قرآنی فکر کے شائق برسرِ روزگار لڑکے کے رشتے کی ضرورت ہے۔

عمر ۳۰ - ۳۵ سال کے درمیان ہو۔

خط و کتابت (ل)۔ معرفت ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

نبی اور رسول

ایک بصیرت افروز خط وکتابت

قرآن کریم نے حضرات انبیائے کرام اور مرسلینِ عظام کے لئے کہیں نبی کا لفظ استعمال کیا ہے کہیں رسول کا۔ یہ دونوں الفاظ، ایک ہی حقیقت کے دو گوشے ہیں۔ محض سمجھنے کی خاطر یوں کہیئے کہ نبوت، خدا سے وحی پانا، اور رسالت، اس وحی کو آگے پہنچانا تھا۔ اور جس طرح یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک رسول، خدا سے وحی تو نہ پاتے اور خدا کے پیغامات لوگوں تک پہنچاتے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ ایک نبی خدا سے وحی پاتے، اور اسے دوسروں تک نہ پہنچاتے۔ اس لئے ہر نبی رسول ہوتا تھا اور ہر رسول کے لئے نبی ہونا لازمی تھا یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں ایک ہی شخصیت کو کہیں نبی کہا گیا ہے اور کہیں رسول۔

لیکن نہ معلوم ہمارے ہاں یہ عقیدہ کہاں سے آگیا کہ رسول وہ ہوتا ہے جسے خدا کی طرف سے کتاب ملتی ہے اور نبی صاحب کتاب نہیں ہوتا۔ حالانکہ نبی اور رسول کی یہ تفریق، قرآن کریم کی واضح تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ یہ غلط عقیدہ کہیں سے آگیا اور اسکے بعد (اندھی تقلید کا مجرا ہو کہ صدیاں گذر گئی ہیں کہ ہمارے ہاں اسے برابر دہرایا جا رہا ہے اور کوئی کھڑا ہو کر اتنا نہیں کرتا کہ (زیادہ نہیں تو کم از کم) قرآن کریم کی دو آیتوں کو سامنے رکھ لے جن میں سے ایک میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے تمام نبیوں کو کتاب دی ہے اور دوسری میں بیان ہوا ہے کہ ہم نے تمام رسولوں کو کتاب دی ۔۔۔ یہاں تک کہ مرزا غلام احمد صاحب نے بھی (جن کا دعویٰ یہ تھا کہ انہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے) بڑی شد و مد سے نبی اور رسول کی اس تفریق کو پیش کیا اور کہا کہ

من نیستم رسول ، نیاوردہ ام کتاب !

اور دعوے یہ کیا کہ میں نبی ہوں، رسول نہیں ہوں۔ (یہ الگ بات ہے کہ ان کے متبعین نے انہیں "صاحب شریعت" یعنی رسول، ثابت کرنے کی بھی کوشش کی۔)

(۳) راولپنڈی سے ایک ماہ نامہ شائع ہوتا ہے — **فیض الاسلام** — اس میں ایک عنوان تفسیر قرآن سے بھی متعلق ہے۔ اس تفسیر کے لکھنے والے ہیں — مولانا محمد فضل قدیر صاحب ظفر ندوی — ہم ان صاحب سے ذاتی طور پر واقف نہیں۔ لیکن "ندوی" سے ظاہر ہے کہ آپ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے فارغ التحصیل عالم ہیں۔ انہوں نے (جون ۱۹۶۶ء کے شمارہ میں) وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کی تفسیر کرتے ہوئے، نبی اور رسول میں یہی فرق بتایا۔ اس پر حسن عباس صاحب نے (جو پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کوئٹہ کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ ہیں) ندوی صاحب کی توجہ قرآنی تعلیم کی طرف منعطف کرائی اور اس سے ایک مختصر سی خط و کتابت وجود میں آگئی جسے ہم بمسرت درج ذیل کرتے ہیں۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ ایک طرف ایک فارغ التحصیل عالمِ دین ہیں اور دوسری طرف ایک "مسٹر" (جنہیں ہمارے علماء حضرات بڑی حقارت سے "دفتر کے بابو" کہکر دھتکارا کرتے ہیں) آپ اس خط و کتابت پر غیر جانبدارانہ نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ ان دونوں میں سے کس کی نگاہ قرآن پر زیادہ وسیع اور گہری ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ قرآن فہمی وہ فضلِ ایزدی ہے جو ہر اس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو اسے لینا چاہے۔ اس میں "مولانا" اور "مسٹر" کی کوئی تخصیص نہیں۔ نہ ہی اس کے لئے ان "اٹھارہ علوم" کی ضرورت ہے جو ہمارے دارالعلوموں میں پڑھائے جاتے ہیں — بلکہ یہ علوم قرآن فہمی کے راستے میں الٹے روک بن جاتے ہیں۔ اور یہ تو آپ کو شاید معلوم ہی ہے کہ ان دارالعلوموں کے نصاب میں قرآن کریم شامل ہی نہیں ہوتا۔

بہرحال، اب اس خط و کتابت کو ملاحظہ فرمائیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی ندوی صاحب! — السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

ماہنامہ "فیض الاسلام" راولپنڈی، بابت ماہ جون ۱۹۶۶ء میں آپ کی بیان کردہ سورۃ "الاحزاب" کی چند آیات کی تفسیر صفحہ ۱ تا ۱۲ نظر سے گزری۔ آپ نے آیت "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اس آیت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی امتیازی شخصیت سے یوں آگاہ کیا

گویا کہ آپ کسی مرد کے باپ ہونے کی بجائے اللہ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں کے خاتمہ پر مبعوث ہوئے ہیں۔ آپ کے بعد کوئی اور نبی نہ آئے گا۔ نبوّت کے مقام سے رسالت کا مقام اخص ہے۔ ہر رسول نبی ہے، مگر ہر نبی رسول نہیں ہے بس جب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو آپ کے بعد کوئی رسول بھی نہیں آئے گا۔

محولہ بالا تحریر کے خط کشیدہ الفاظ "ہر رسول نبی ہے اور ہر نبی رسول نہیں ہے" سے آپ کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اور نبی میں کوئی فرق ہے۔ رسالت اور نبوت دو علیحدہ علیحدہ منصب ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ کے الفاظ "ہر رسول نبی ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہے" سے آپ کا یہ خیال بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی ایسی خاص چیز ہے جو رسول کو نبی سے متمیّز کرتی ہے اور یہ وہ چیز ہے جو نبی کے پاس نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایک رسول منصبِ نبوت کا بھی حامل ہے، اس کے برعکس ایک نبی منصبِ رسالت کا حامل نہیں، تبھی تو ہر نبی رسول نہیں ہے۔

اس ضمن میں، میں آپ سے درخواست کروں گا کہ ازراہِ کرم مندرجہ ذیل نکات کی وضاحت قرآنِ کریم کی روشنی میں فرما دیجیے۔

(۱) رسول اور نبی میں کیا فرق ہوتا ہے؟

(۲) وہ کون سی چیز ہے جو رسول کو نبی سے متمیّز کرتی ہے؟

جواب کا انتظار کروں گا۔

خیر طلب

حسن عباس

۲/۳ سپرنٹنڈنٹ ہاؤس ۔ وائٹ روڈ۔ کوئٹہ

۱۲ر جون ۱۹۶۶ء

مکرمی!

السلام علیکم! — بواسطہ ادارہ آپ کا نامۂ گرامی ملا۔ اس کم علم کی طرف سے یہ جواب ہے۔

"رسالت اور نبوت علیحدہ علیحدہ باہم متغائر چیزیں نہیں ہیں۔ رسالت بھی نبوت ہے مگر ایسی نبوّت جو عام نبوت سے اخص ہے۔ امام بھی نمازی ہے اور مقتدی بھی نمازی ہے۔ نماز دونوں میں قدرِ مشترک ہے مگر نماز باجماعت میں امام کا مقام خاص ہے۔ وہ مقتدیوں کی اقتداء نہ کرے، مقتدیوں کو اس کی اقتداء کرنا پڑے گی۔

رسول اور نبی میں قدرِ مشترک نبوت ہے۔ رسول نبی ہے مگر ایسا نبی جو صاحبِ شریعت ہو۔ اور جو صرف نبی ہے اس کا کام یہ ہے کہ رسول کی شریعت پر خود چلے اور لوگوں کو چلائے۔ ہر نبی پر وحی آتی۔ حدیث میں ان احکام کا ذکر ہے جو وحی میں حضرت یحییٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئے کہ وہ خود ان پر عمل کریں اور بنی اسرائیل کو جمع کر کے سنادیں۔ مگر حضرت یحییٰ فقط نبی تھے۔ رسول نہ تھے۔ ان ہی کے ہمعصر اور ہم شہر حضرت عیسےٰ علیہ السلام رسول تھے اور صاحب کتاب و صاحب شریعت تھے۔ حضرت یحییٰ ان کے متبع تھے۔ قرآن پاک میں رسول کو نبی کہا گیا ہے مگر جو صرف نبی تھا اس کو رسول نہیں کہا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا شمار پانچ "اولوالعزم من الرسل" میں سے ہے مگر ان کو "صدیقاً نبیاً" کہا گیا ہے۔

حضرت اسحاق و حضرت یعقوب علیہما الصلوٰۃ والسلام نبی تھے، رسول نہ تھے۔ صحف ابراہیم کی دعوت دیتے تھے۔ "وھبنا لہ اسحٰق و یعقوب وکلاً جعلنا نبیاً" (مریم - ۳) ہم نے اس کو (یعنے حضرت ابراہیم کو) اسحاق اور (پوتا) یعقوب عطا فرمایا۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے نبوت دی تھی۔

پھر چند آیتوں کے بعد حضرت اسمٰعیل کا ذکر یوں آیا۔ "واذکر فی الکتاب اسمٰعیل انّہٗ کان صادق الوعد وکان رسولاً نبیاً" (مریم - ۴)۔ اور (اے پیغمبر) الکتاب (یعنی قرآن) میں اسمٰعیل کا ذکر کر، بلاشبہ وہ اپنے قول میں سچا تھا۔ اور رسول اور نبی تھا۔ ان دونوں حیثیتوں کے جامع ہونے کی وجہ سے ان کا مرتبہ حضرت اسحاق سے بلند تھا۔ جیسا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انّ اللہ اصطفٰی من ولد ابراھیم اسمٰعیل" (مسلم)۔ اللہ تعالےٰ نے ابراہیم کی اولاد میں اسمٰعیل کو برتری دی۔

اللہ تعالےٰ نے ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دونوں مرتبوں رسالت و نبوت کا جامع بنایا۔ "فاٰمنوا باللہ و رسولہ النبیّ الاُمّیّ" (اعراف ۲)۔ پس ایمان لاؤ اللہ اور اسکے رسول نبی امی پر۔

اس آیت پر قرطبی لکھتے ہیں "فان الرسول اخص من النبی وقدّم الرسول اھتماماً لمعنی الرسالۃ"۔ رسول نبی سے اخص ہے اور (اس آیت میں) رسول کو مقدم رکھا بطور اہتمام معنویتِ رسالت۔"

بہت سی آیتیں ہیں جن سے رسول کی امتیازی شان واضح ہوتی ہے۔ مثلاً "وماکان ربک مھلک القریٰ حتیٰ یبعث فی اُمّھا رسولاً یتلوا علیھم اٰیٰتنا" (قصص ۶) اور آپ کا رب ان بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ انکے صدر مقام میں کسی رسول کو نہ بھیجے کہ وہ انکو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے۔

"رسول کا صاحب شریعت ہونا اسکو نبی سے متمیز کرتا ہے۔"

محمد فضل قدیر ظفر۔ ندوی
۲۲ ظفر علی روڈ - لاہور

۲۸ جون ۱۹۶۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

گرامی قدر ندوی صاحب ! سلام و رحمت !

آپ نے جواب دینے میں جو زحمت فرمائی ہے، میں اس کا نہایت ہی ممنون ہوں۔ اللہ تعالےٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

محترمی! میں قرآن حکیم کا ایک ادنیٰ سا طالبعلم ہوں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ایک طالب علم کو علم کی کتنی جستجو ہوتی ہے۔ اسی جذبہ کے تحت میں نے آپ سے وضاحت کی درخواست کی تھی۔ آپ کا پھر ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ جواب کی زحمت گوارا فرمائی۔ اسی جذبۂ تحصیلِ علم کے تحت میں آپکی وضاحت سے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے عریضہ مؤرخہ ۱۲ر جون ۷۶ء میں حسبِ ذیل نکات کی وضاحت کی درخواست کی تھی۔

(۱) رسول اور نبی میں کیا فرق ہے؟

(۲) وہ کون سی چیز ہے جو رسول کو نبی سے متمیز کرتی ہے؟

آپ نے جو وضاحت اپنے نامۂ گرامی مؤرخہ ۲۲ر جون ۱۹۷۶ء میں فرمائی ہے اس کے پیشِ نظر نکتہ ۲ اور اس کی وضاحت کے متعلق پہلے عرض کرنا مناسب رہے گا۔ کیونکہ یہی اصولی نکتہ ہے۔ اس سلسلہ میں آپ نے فرمایا ہے:-

"رسول کا صاحبِ شریعت ہونا، اس کو نبی سے متمیز کرتا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول "صاحبِ کتاب" ہوتا ہے اور نبی "بغیر کتاب"۔ اور "کتاب" ہی ان دونوں میں وجۂ امتیاز ہے۔ مگر محترم! مؤدبانہ عرض ہے کہ نبی اور رسول کی حیثیت کا یہ امتیاز انسانوں کا خود ساختہ معلوم ہوتا ہے۔ قرآن حکیم اس کی تائید نہیں کرتا۔ برعکس اس کے قرآن حکیم کی رُو سے نبوت اور رسالت ایک ہی منصب کے دو نام اور ایک ہی سکّہ کے دو رُخ ہیں۔ اصطلاح کے اعتبار سے نبوت کے معنیٰ ہیں وحی کا ملنا، اور رسالت کے معنے ہیں اس وحی کو آگے پہنچانا — اور فارسی میں بھی تو رسول کو ایلچی کہتے ہیں، اور اُردو میں پیغامبر یعنی پیغمبر — جب ہم رسول یا پیغمبر کہتے ہیں تو اس کیفیت میں ایک ایسا مقام بھی آجاتا ہے جہاں متعلقہ شخص وہ پیغام (رسالت) حاصل کرتا ہے جس کو لے کر وہ آگے بڑھتا ہے اور دوسروں کو (Convey) کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالےٰ سے بذریعہ وحی پیغام (رسالت) حاصل کرتا ہے وہ صرف اس کی ذات محدود نہیں ہوتے۔ اگرچہ انسان ہونے کی جہت سے سب سے پہلے وہ خود اُس پیغام کے آگے سرِتسلیم خم کرتا ہے، پھر اُس کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ یہ واسطہ (Medium) ہوتا

ہے خدا اور انسانوں کے درمیان۔ اور اگر کسی شخص کو خدا کی طرف سے وحی نہ ملے تو وہ لوگوں تک کیا پہنچائے گا۔ لہٰذا نبوت کے بغیر رسالت اور رسالت کے بغیر نبوت کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ چونکہ نبوت اور رسالت، ایک ہی منصب کے دو پہلو ہیں، اس لئے قرآنِ کریم میں اللہ تعالےٰ نے حاملانِ وحی کو کہیں انبیا۔ کہا ہے اور کہیں رسول۔

جہاں تک کتاب (شریعت) کا تعلق ہے، قرآنِ حکیم کی رُو سے بغیر کتاب نبی ہو ہی نہیں سکتا۔ بالفاظِ دیگر ہر نبی اور رسول کے ساتھ کتاب نازل کی گئی۔ رسولوں کے متعلق ارشاد ہے:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ۔ (۵۷/۲۵)

اور بلاشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا۔ اور ان سب کے ساتھ کتاب (ضابطۂ خداوندی) نازل کی۔

اور اسی طرح ہر نبی کے ساتھ کتاب نازل کی گئی:۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۔۔۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۔۔ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ۔ (۲/۲۱۳)

چونکہ نوعِ انسانی کو ایک اُمت کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا تھی اس لئے خدا نے انبیاء کو بھیجا جو اعمالِ صالحہ کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دینے والے اور اعمالِ بد کے دردناک نتائج و عواقب سے آگاہ کرنے والے تھے۔ اور ان سب کے ساتھ کتاب (ضابطۂ قوانین) نازل کی، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان حق و باطل کا فیصلہ کر دے۔

لفظ مَعَهُمْ (ان سب کے ساتھ) سے کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پہلی آیت میں رسولوں کا ذکر ہے اور ساتھ کتاب ہے۔ اور دوسری آیت میں انبیا۔ کا ذکر ہے اور ساتھ کتاب ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی رسول، اور کوئی نبی بغیر کتاب (شریعت) نہیں آیا۔ لہٰذا تشریعی اور غیر تشریعی نبی کی تفریق کا تصور یکسر غیر قرآنی اور غلط ہے۔

چونکہ آیت ۲/۲۱۳ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم یعنے خاتم النّبیّین پر نازل ہوئی تھی اس لئے اور "نبیّین" کے ساتھ "ال" کی رعایت سے حضورؐ سے پہلے تمام انبیاء کرام کو محیط ہے۔ بالفاظِ دیگر حضورؐ سے پہلے جتنے بھی نبی گزرے ہیں، ہر ایک کے ساتھ ایک کتاب (شریعت) نازل کی گئی تھی۔

اور آگے بڑھیئے اور قرآن حکیم کے ان مقامات کو سامنے لائیے جہاں ایمان کی شرائط بیان کی گئی ہیں:۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ (۲/۱۷۷)

یہ کوئی بھلائی کی بات نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو۔ البتہ بھلائی اور نیکی اُس شخص کی بھلائی اور نیکی ہے جو اللہ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور انبیاء پر ایمان لاتے۔

آگے ارشاد ہے:۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ۔ (۲/۲۸۵)

اللہ کا رسول، اس پر ایمان رکھتا ہے جو اُس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا۔ اور جو لوگ (دعوتِ حق پر) ایمان لاتے ہیں وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سب اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر، اور اُس کے رسولوں پر ایمان لائے۔

محولا بالا آیات میں ایک جگہ "نبیین" اور دوسری جگہ "رُسل" کہا۔ باقی شرائط مشترکہ ہیں۔ اسی طرح جہاں اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی گئی ہے، وہاں ایک جگہ انہیں "رُسل" کہا گیا ہے اور دوسری جگہ "انبیاء"۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ۔ (۲/۲۵۳)

یہ ہمارے رسول ہیں، جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے (یعنے اگرچہ پیغمبری کے لحاظ سے سب کا درجہ یکساں ہے لیکن اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے مختلف درجے رکھتے ہیں) ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا، بعض ایسے تھے جن کے درجے (ان کے وقتوں اور حالتوں کے مطابق دوسری باتوں میں) بلند کئے گئے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:۔

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ
عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا - (۱۷/۵۵)

اور اے پیغمبرِ اسلام! تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں کون کون لوگ ہیں اور بلاشبہ ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی۔ (یعنے اگرچہ پیغمبری کے لحاظ سے سب کا درجہ یکساں ہے مگر اپنی اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے مختلف درجے رکھتے ہیں) اور داؤد کو ہم نے زبور عطا کی۔

مندرجہ بالا تصریحاتِ قرآنی سے بالکل واضح ہے کہ :-

۱:- اصطلاح کے اعتبار سے نبوت کا معنے ہے وحی کا ملنا اور رسالت کے معنے ہیں اُس وحی کو دوسروں تک پہنچانا۔

۲:- جو شخص اللہ تعالےٰ سے وحی حاصل کرتا ہے، وہ اُس کی ذات تک محدود نہیں ہوتی (اگرچہ انسان ہونے کی جہت سے سب سے پہلے وہ خود اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے) بلکہ وہ حاصل ہی اس لئے کرتا ہے کہ وہ اُسے دوسروں تک پہنچاتے۔

۳:- جب کوئی شخص وحی یا پیغام حاصل نہ کرے، وہ دوسروں تک کیا پہنچائے گا!

۴:- جب کوئی شخص وحی حاصل کرتا ہے تو نبی کہلاتا ہے اور جب اس وحی (پیغام) کو لوگوں تک پہنچاتا ہے تو رسول کہلاتا ہے۔

۵:- اس لئے نبوت اور رسالت ایک ہی منصب کے دو پہلو اور ایک ہی شے کے دو رُخ ہیں۔ ان سعادتمند ہستیوں کو کبھی نبی کہہ کر پکارا گیا تو کبھی رسول۔ مطلب دونوں سے ایک ہی ہے۔

۶:- کتاب کے بغیر کوئی شخص نبی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کوئی رسول بھی کتاب کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ دونوں ایک ہی شخص کی کیفیتیں ہیں۔

۷:- تشریعی اور غیر تشریعی نبوت خود ساختہ تقسیم ہے۔ قرآن سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔

۸:- رسول اور نبی دونوں صاحبِ شریعت ہیں۔ اس لئے منصب کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

فلہذا - آپ کا یہ ارشاد کہ :-

"رسول کا صاحبِ شریعت ہونا اُس کو نبی سے متمیّز کرتا ہے"

نصوصِ قرآنی سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔

اب وہ وضاحت جو آپ نے نکتہ ۱ میں فرمائی ہے، اگرچہ اصولی طور پر طے ہو جاتی ہے تاہم اس میں کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق کچھ مزید عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔

"رسالت اور نبوت علیحدہ علیحدہ باہم متغائر چیزیں نہیں ہیں۔ رسالت بھی نبوت ہے مگر ایسی نبوت جو عام نبوت سے اخص ہے۔ امام بھی نمازی ہے اور مقتدی بھی نمازی ہے۔ نماز دونوں میں قدر مشترک ہے۔ مگر نماز باجماعت میں امام کا مقام خاص ہے۔ وہ مقتدیوں کی اقتداء نہ کرے گا، مقتدیوں کو اُس کی اقتداء کرنا پڑے گی۔"

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ آپ نے مساجد میں نماز ادا کرتے وقت امام اور مقتدی کی جو تقسیم بیان فرمائی ہے وہ تو مسجد کی چار دیواری تک محدود ہوتی ہے۔ اس کا باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس معنوی تقسیم کا اثر تو یہ ہے کہ ایک آدمی وقتی طور پر امامت کراتا ہے۔ اور آپ نے دلیل یہ دی ہے کہ دوسرے نمازی اُس کی اقتدا کرتے ہیں۔ جونہی لوگ مسجد کی چار دیواری سے باہر نکلتے ہیں تو اکثر لوگ کاروں، رکشوں اور تانگوں میں سوار ہو کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ مگر امام بیچارے کے پاس سائیکل تک نہیں ہوتی اور وہ سب کے پیچھے پاؤں گھسیٹتا چلا جاتا ہے اور وہی نمازی جو چند ساعت پہلے اُس کی آواز پر رکوع و سجود میں جُھک جاتے تھے، مسجد کی چار دیواری کے باہر وہ امام صاحب کو پہچانتے بھی نہیں ہیں۔

ایک نبی یا رسول امام ہوتا ہے بنی نوع انسان کا۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ "اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔" اور یہ تفریق ابدی ہوتی ہے۔ یہ امامت، نبوت اور رسالت ہی ہوتی ہے۔ جو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔

اور یہ وہ منصب ہے جس کی وجہ سے ایک نبی یا رسول کا مقام اخص ہوتا ہے عام انسانوں سے، نہ کہ ایک دوسرے سے۔

آپ آگے فرماتے ہیں:۔

"رسول اور نبی میں قدر مشترک نبوت ہے۔ رسول نبی ہے مگر ایسا نبی جو صاحب شریعت ہو۔ اور جو صرف نبی ہے اس کا کام یہ ہے کہ رسول کی شریعت پر خود چلے اور لوگوں کو چلائے۔ ہر نبی پر وحی آئی۔"

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ قرآنی حقائق کی رُو سے جو پہلے عرض کئے جا چکے ہیں جس طرح

رسول اور نبی میں قدرِ مشترک "نبوت" ہے۔ اسی طرح نبی اور رسول میں قدرِ مشترک "رسالت" ہے کیونکہ یہ دونوں ایک ہی منصب کے دو پہلو ہیں۔ دونوں صاحبِ شریعت ہوتے ہیں۔ اس طرح دونوں اپنی اپنی شریعت کے مطابق سرگرمِ عمل ہوتے ہیں، اگرچہ یہ شریعت دوسرے نبی کی شریعت سے متضاد یا متخالف نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہے۔ حوالے کے لئے سورۃ مائدہ کی آیات ۴۶ اور ۴۸ ملاحظہ فرمائیں۔

پھر آپ نے فرمایا ہے:۔

"حضرت یحییٰ فقط نبی تھے، رسول نہ تھے۔ اُن کے ہمعصر اور ہم شہر حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام رسول تھے اور صاحبِ کتاب اور صاحبِ شریعت تھے۔ حضرت یحییٰ اُن کے متبع تھے"

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، نبی اور رسول ایک ہی منصب کے دو پہلو ہیں اور دونوں کو کتاب عطا ہوتی ہے۔ جو اُس نبی اور رسول کی شریعت ہوتی ہے اور اُس کتاب کی وجہ سے جو اُسے بذریعہ وحی ملتی ہے، وہ شخص نبی یا رسول کہلاتا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا حضرت یحییٰ پر کوئی کتاب نازل ہوتی تھی۔ اگر کتاب نازل ہوئی تھی تو لامحالہ آپ رسول ہیں۔ سورۃ الانعام کے دسویں رکوع میں ارشاد ہے:

وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ ۗ
إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ كُلًّا
هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ ۖ وَمِن ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ
وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ
وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ ۖ كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ وَ
إِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ ۝
.... أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (۶/۸۳-۸۹)

یہ ہماری دلیلیں ہیں جو ہم نے ابراہیمؑ کو اپنی قوم پر غالب آنے کے لئے عطا کی تھیں۔ ہم جس کے مرتبے چاہتے ہیں بلند کرتے ہیں۔ بے شک تیرا پروردگار حکمت والا باخبر ہے۔ اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحٰق اور (پوتا) یعقوب دیا۔ ہم نے ان سب کو راہِ راست دکھائی، وہی راہ جسے ہم پہلے نوحؑ کو دکھا چکے ہیں اور ابراہیم کی نسل میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون کو بھی یہی راہ دکھائی

ہم اس طرح نیک کرداروں کو اُن کی نیک کرداری کا بدلہ دیتے ہیں۔ اور زکریا، یحییٰ،
عیسےٰ اور الیاس کو، کہ یہ سب صالح انسانوں میں سے تھے۔ اور نیز اسماعیل، الیسع،
یونس اور لوط کو، کہ ان سب کو ہم نے دنیا والوں پر برتری دی تھی ...... اے پیغمبر!
یہ وہ لوگ ہیں، جنہیں ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا فرمائی۔

قرآن حکیم کے اس واضح ارشاد کے مطابق، مذکورہ بالا اصحاب میں سے ہر ایک کو کتاب اور نبوت دی گئی۔ چونکہ ہر ایک کو کتاب (شریعت) عطا ہوئی، اس لئے یہ سب کے سب رسول ہیں۔ ان میں حضرت یحییٰ کا نام بصراحت موجود ہے، اور اس آیت کے مطابق آن کو بھی نبوت کے ساتھ کتاب ملی چنانچہ حضرت یحییٰ بھی رسول ہیں۔ اس لئے آپ کا یہ ارشاد کہ "یحییٰ فقط نبی تھے، رسول نہ تھے" نصِ قرآنی کے خلاف ہے۔

باقی رہی آپ کی یہ بات کہ حضرت یحییٰ حضرت عیسےٰ کے متبع تھے، جس کی رُو سے آپ حضرت عیسےٰ کی شریعت کی طرف دعوت دیتے تھے، اور آپ کی اپنی شریعت کوئی نہ تھی، آپ کا یہ استدلال بھی قرآن حکیم کے خلاف ہے۔ اوّل تو قرآن حکیم میں یہ کہیں نہیں کہ حضرت یحییٰ حضرت عیسےٰ کے متبع تھے اور انکی شریعت کی طرف دعوت دیتے تھے۔ اگر ایسا ہو تو بھی یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کی اپنی کتاب (شریعت) کوئی نہیں تھی۔ اس پر حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت شاہد ہے۔ مثلاً حضور برعکس دوسرے انبیاء کے تمام نوعِ انسانی کے لئے رسول ہیں۔ اور آپ کی کتاب (شریعت) یعنے قرآن حکیم بھی تمام اقوامِ عالم کے لئے ہدایت ہے جس کی موجودگی میں اب کسی دوسری کتاب کی اتباع لازم نہیں رہی۔ اگرچہ اُن پر ایمان لازمی ہے۔ ایسی شریعت کا حامل کہ جس کے ہوتے ہوئے اب کسی اور شریعت کی ضرورت نہیں (نہ سابقہ نہ آئندہ) اسکے متعلق ارشاد ہے:۔

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ
مِنَ الْمُشْرِكِينَ (16/123)

اور پھر (اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ ابراہیمؑ کے طریقہ کی اتباع
کرو، ہر طرف سے ہٹا ہوا (صرف دینِ حق پر کاربند رہنے والا) اور مشرکوں
میں سے نہ تھا۔

یہی نہیں، اُمتِ مسلمہ کو بھی ملتِ ابراہیم کی اتباع کی تلقین فرمائی:۔

قُلْ صَدَقَ اللَّهُ ۗ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (3/95)

(اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہدیجئے کہ اللہ نے سچائی ظاہر کردی۔ پس ابراہیمؑ کے طریقہ کی اتباع کرو، جو ہر طرف سے ہٹ کر صرف اللہ ہی کا ہوکر رہتا ہے اور یقیناً ابراہیمؑ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔

ان آیاتِ مقدسہ میں واضح طور پر موجود ہے کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیمؑ کے متبع تھے۔ یہی نہیں، بلکہ لوگوں سے بھی یہی کہا کہ ملتِ ابراہیمی کی اتباع کرو۔ یہی صحیح راستہ ہے۔ اس سے یہ استدلال تو نہیں کیا جاسکتا کہ حضورؐ کی اپنی شریعت یا کتاب نہ تھی۔ اس طرح آپ کا یہ استنباط کہ چونکہ حضرت یحییٰؑ حضرت عیسےٰؑ کے متبع تھے، اس لئے اُن کی اپنی کتاب یا شریعت نہیں تھی اور نہ ہی وہ رسول تھے، صحیح نہیں۔

آپ آگے فرماتے ہیں:۔

حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہما الصلوٰۃ والسلام نبی تھے رسول نہ تھے، صحفِ ابراہیم کی دعوت دیتے تھے۔

اس ضمن میں عرض ہے کہ جب رسالت کا معیار کتاب (شریعت) ہے تو ہم سورۃ الانعام کے دسویں رکوع میں دیکھ چکے ہیں کہ ان ہر دو اصحاب کو بھی کتاب دی گئی تھی جس کی وجہ سے یہ بھی رسول تھے۔ لیکن دوسری جگہ ہے:۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ
اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ
عِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ
وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ
وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ
لِلنَّاسِ عَلَي اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۴/۱۶۳-۱۶۵)

اور اے پیغمبرِ اسلام! بلاشبہ ہم نے تمہاری طرف بالکل اُسی طرح وحی کی ہے جس طرح ہم نے نوحؑ کی طرف وحی بھیجی، اور نوحؑ کے بعد دوسرے انبیاء کی طرف وحی کی تھی۔ اور جس طرح ہم نے ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ، اور اولادِ یعقوبؑ، عیسےٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ، اور سلیمانؑ کی طرف کی تھی۔ اور اے پیغمبر! ہم نے تمہیں بالکل اُسی طرح کتاب (قرآن) عطا کی ہے جس طرح ہم نے داؤدؑ کو زبور عطا کی

تھی اور (کچھ ان ہی حضرات پر منحصر نہیں) اور بھی بہت رسول ہیں، جن کے کچھ واقعات ہم
نے اس سے پہلے تم سے بیان کر دیئے ہیں اور بہت سے رسول ایسے ہیں جن کے واقعات
ہم نے تم سے بیان نہیں کئے۔ (جس طرح ہم نے اُن پر وحی کی تھی اور کتاب دی
تھی)، بالکل اسی طرح ہم نے تم پر بھی وحی کی ہے اور کتاب عطا کی، اور خدا نے
موسیٰ سے اچھی طرح کلام فرمایا تھا۔ یہ سب کے سب خدا کے رسول تھے جو بشیر و
نذیر تھے، تاکہ رسول کے آجانے کے بعد لوگوں کی خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔ اور تم
جانتے ہی ہو کہ خدا بڑا غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔

ان آیاتِ مقدسہ میں مذکورہ بالا تمام حضرات کو رسول کہا گیا ہے، جن میں حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما الصلوٰۃ والسلام دونوں بصراحت موجود ہیں۔ یعنی دونوں رسول ہیں۔ اس طرح آپ کا یہ ارشاد کہ "حضرت اسحٰق اور یعقوب نبی تھے، رسول نہ تھے"، صحیح نہیں۔ قرآنِ حکیم کی رُو سے دونوں رسول ہیں اور صاحبِ شریعت ہیں۔

قرآنِ حکیم میں اُن تمام چوبیس پیغمبروں کو جن کا تعلق سامی نسل سے ہے، اور جن کے نام قرآنِ کریم میں دیئے گئے ہیں، رسول کہا ہے۔

محترمی! جیسا کہ میں نے آغاز میں عرض کیا ہے، میں قرآنِ حکیم کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ جہاں تک میں نے قرآنِ حکیم کا مطالعہ کیا ہے، مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبی اور رسول ایک ہی منصب کے دو پہلو اور ایک ہی شے کے دو رُخ ہیں، اگرچہ اصطلاح کے اعتبار سے نبوت کے معنے ہیں وحی کا ملنا اور رسالت کے معنی ہیں اس وحی کو دوسروں تک پہنچانا۔ تاہم یہ ایک ہی ذات کی دو کیفیتیں ہیں، اس لئے نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں۔

آخر میں، میں آپ سے استدعا کروں گا کہ آپ میری معروضات پر قرآن کریم کی روشنی میں غور فرمائیں گے اور اپنے خیالات سے مطلع فرمائیں گے۔ فقط

خیر طلب

حسن عباس۔ ۳/۱ سپرنٹنڈنٹ ہاؤس۔ وائٹ روڈ۔ کوئٹہ ۱۸ر جولائی ۱۹۶۶ء

مکرمی! ـــ السلام علیکم!

آپ کا طویل نوازش نامہ ملا۔ رسول اور نبی کے بارے میں آپ کا مسلک منفرد نہیں

ہے۔ بعض اہلِ علم کا مسلک آپ سے ملتا جلتا ہے۔ فتح محمد تائب لکھنوی کی تفسیر خلاصۃ التفاسیر کی تعریف مولانا عبدالماجد نے اپنی تفسیر ماجدی میں لکھی ہے۔ خلاصۃ التفاسیر کی عبارت یہ ہے۔

"نبی و رسول میں فرق مشکل ہے"

مگر اکثر اہلِ علم نے رسول اور نبی میں امتیاز اس آیت سے قائم کیا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ مِنْ قَبْلِ مِنْ رَسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ (سورہ حج)

"اور نہیں بھیجا ہم نے پہلے تجھ سے کوئی رسول اور نہ کوئی نبی۔"

شرح عقاید نسفی اور تفسیر کبیر میں لکھا ہے۔ "رسول وہ بشر ہے جو کتاب کے ساتھ بغرض تبلیغ احکام بھیجا جائے اور نبی میں یہ قیود نہیں"

النظم الفرائد (مصنفہ محمد حسین سنبلی) میں لکھا ہے "رسول میں کتاب و دین جدید و شرع جدید مشروط ہے۔" رسول کے معنے پیغام رساں اور نبی کے معنے خبردار۔"

جمہور مفسرین اور متکلمین کا مسلک یہی ہے کہ نبی عام ہے۔ ہر رسول نبی ہے اور رسول خاص ہے۔ ہر رسول نبی نہیں۔ تائید میں یہ روایت منقول ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

"ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی ہیں، ان میں سے تین سو تیرہ رسول ہیں۔"

آپ اس امتیاز کا ثبوت قرآن سے مانگتے ہیں، تو واضح و بیّن الفاظ میں ایسا ثبوت قرآن سے ملنا مشکل ہے۔

بہت سے مسائل کی تفصیل قرآن میں نہ ملے گی۔ نماز کی رکعتیں قرآن میں کہاں ہیں۔ التحیات کا ذکر ہی نہیں، ختنہ کا ذکر ہی نہیں، زکوٰۃ کی تفصیل ہی نہیں۔ ماشاء اللہ قرآن میں آپ کا مطالعہ وسیع ہے۔ اللّٰھم زد فزد۔ محدود سی علمیت والا یہ راقم آثم اس سے زیادہ نہیں جانتا۔

محمد فضل قدیر ظفر۔ ندوی

۲۲۔ ظفر علی روڈ۔ لاہور

طلوع اسلام

خط و کتابت آپ نے ملاحظہ فرمالی۔ چونکہ ندوی صاحب نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ "محدود سی علمیت والا یہ راقم آثم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا"۔ جو اس امر کا اشارہ ہے کہ یہ خط وکتابت

ختم کر دی جاتے، اس لئے حسن عباس صاحب نے اس سلسلہ کو آگے نہیں بڑھایا۔

آپ نے ایک بات نمایاں طور پر دیکھی ہوگی۔ کہ حسن عباس صاحب اپنے ہر دعوے کی سند میں قرآن کریم کی آیت پیش کرتے ہیں لیکن ندوی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ خلاصۃ التفاسیر میں یوں لکھا ہے۔ شرح عقائد نسفی اور تفسیر کبیر میں یوں لکھا ہے۔ صاحب النظم الفرائد کا ارشاد یہ ہے اور "جمہور مفسرین اور متکلمین کا مسلک یہی ہے کہ نبی عام ہے۔ ہر رسول نبی ہے اور رسول خاص ہے۔ ہر رسول نبی نہیں ہے" (غالباً ندوی صاحب یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہر نبی رسول نہیں ہے — طلوعِ اسلام)۔ بس یہ ہے وہ ذہنیت جو ان حضرات کو اللہ کی کتاب کی طرف آنے نہیں دیتی، اور خلاف قرآن عقاید و مسالک پر جمائے رکھتی ہے۔ یعنی ان کے نزدیک سند و حجت خدا کی کتاب نہیں، "جمہور مفسرین و متکلمین" کا مسلک ہے۔ خواہ وہ خدا کی کتاب کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔

ندوی صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ

> نبی کا کام یہ ہے کہ رسول کی شریعت پر خود چلے اور لوگوں کو چلائے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

> حضرت یحییٰؑ فقط نبی تھے۔ رسول نہ تھے۔ ان ہی کے ہمعصر اور ہم شہر حضرت عیسیٰؑ رسول تھے اور صاحبِ کتاب و صاحبِ شریعت تھے۔ حضرت یحییٰؑ انکے متبع تھے۔

اس بات کا جواب تو حسن عباس صاحب دے چکے ہیں کہ قرآن کریم نے حضرت یحییٰؑ کو رسول کہا ہے ہم اس مقام پر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ندوی صاحب کے ارشاد کے مطابق حضرت یحییٰؑ کے ذمے وہی کام عاید کیا گیا جو رسول کے ہر امتی کا فریضہ ہوتا ہے۔ بہت اچھا۔ لیکن اسکے ساتھ ہی ندوی صاحب لکھتے ہیں کہ

> حدیث میں ان احکام کا ذکر ہے جو وحی میں حضرت یحییٰؑ پر نازل ہوتے کہ وہ خود ان پر عمل کریں اور بنی اسرائیل کو جمع کر کے سنا دیں۔

اب صورت یوں ہوئی کہ ایک طرف حضرت یحییٰؑ کو یہ حکم دیا گیا کہ تمہارے ہم عصر اور ہم شہر حضرت عیسیٰؑ کی طرف جو احکام بھیجے جاتے ہیں، تم ان پر عمل کرو اور لوگوں سے بھی ان پر عمل کراؤ اور دوسری طرف خود حضرت یحییٰؑ کی طرف احکام بذریعہ وحی بھیجے جاتے تھے۔ جن پر وہ خود بھی عمل کرتے تھے اور لوگوں تک بھی انہیں پہنچاتے تھے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

اس قسم کی باتیں ایک "عالمِ دین" ہی کر سکتا ہے۔ ہم عامیوں کے بس کی یہ بات نہیں۔

پھر ندوی صاحب فرماتے ہیں:۔

آپ (رسول اور نبی کے) اس امتیاز کا ثبوت قرآن سے مانگتے ہیں تو واضح اور بیّن الفاظ میں ایسا ثبوت قرآن سے ملنا مشکل ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآن کریم نے واضح اور بیّن الفاظ میں بتا دیا، کہ نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں ہوتا، دونوں کو کتاب ملتی ہے۔ تو پھر کیا وہ خود ہی یہ بھی کہے گا کہ نبی اور رسول میں فرق ہوتا ہے؟ لیکن قرآن کہتا رہے کہ ان میں فرق نہیں ہوتا، یہ ضرور فرق پیدا کر کے رہیں گے۔ اگر قرآن اپنے کسی دعویٰ کے خلاف کچھ نہیں کہتا، تو ان حضرات کے نزدیک (معاذ اللہ) یہ قرآن کا نقص ہے، جسے "جمہور مفسرین اور متکلمین" دور کر دیتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ نبی اور رسول میں فرق نہیں ہوتا۔ یہ کہتے ہیں کہ فرق ہوتا ہے۔ اور انہی کا ارشاد، ہمارے علماء کرام کے نزدیک سند ہوتا ہے۔

اور اس کے بعد دلیل ملاحظہ فرمایئے:۔

اور بہت سے مسائل کی تفصیل قرآن میں نہ ملے گی۔ نماز کی رکعتیں قرآن میں کہاں ہیں۔ التحیات کا ذکر ہی نہیں۔ ختنہ کا ذکر ہی نہیں ......"

"مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ" اسے کہتے ہیں۔ مستفسر کہتا ہے کہ قرآن کریم میں بہ نصِ صریح آیا ہے کہ نبی کو بھی کتاب ملتی تھی اور رسول کو بھی۔ اس لئے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ مجیب کا جواب یہ تھا کہ ان دونوں میں فرق ہے۔ مستفسر نے پوچھا کہ قرآن میں اس فرق کا ثبوت کہاں ہے؟ جواب ملا کہ بتاؤ! قرآن میں التحیات کا ذکر کہاں ہے — اناللہ۔

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ انداز کس ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے؟ اور اس میں ندوی صاحب کی کوئی تخصیص نہیں ان تمام حضرات کی ذہنیت ایسی ہی ہوتی ہے۔

ان حضرات کا پیش کردہ عقیدہ یہ ہے کہ رسول صاحبِ شریعت ہوتا ہے اور نبی، صاحبِ شریعت نہیں ہوتا۔ وہ رسول کی شریعت کا متبع ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کو خاتم النبیین کہا ہے۔ خاتم الرسل نہیں کہا۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ کے بعد کوئی غیر تشریعی نبی نہیں آسکتا، لیکن تشریعی نبی (یعنی رسول) آسکتا ہے۔ کیونکہ قرآن نے اس کی نفی نہیں کی، تو فرمایئے! آپ کا کیا جواب ہوگا؟ مرزا صاحب نے تو خاتم کے معنی ہی "نبی گر" کر دیئے اس لئے ان کی نگاہ اس طرف نہیں گئی۔ ورنہ (اگر وہ خاتم کے معنی ختم کرنے والا" لیتے تو) ان کے

لئے رسول (صاحب شریعت) ہونے کا دعوےٰ بہت آسان تھا۔ وہ اِن حضرات سے کہہ سکتے تھے کہ قرآن نے انبیاء (غیر تشریعی نبیوں) کا سلسلہ ختم کیا ہے، رُسل (تشریعی نبیوں) کا سلسلہ ختم نہیں کیا۔ اس لئے میں رسول ہوں۔ ایران کے بہاء اللہ نے یہی دعویٰ کیا تھا۔ یعنی صاحب کتاب نبی (رسول) کا دعویٰ۔ اس کا جواب یہ حضرات دے ہی نہیں سکتے جو نبی اور رسول میں "صاحب کتاب" ہونے کا فرق کرتے ہیں۔ اس کا جواب تو قرآن ہی دے سکتا ہے جو نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس لئے جب وہ نبی اکرمؐ کو خاتم النبیین کہتا ہے تو اس سے وحی کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ حضورؐ کے بعد کوئی شخص صاحب وحی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا خواہ وہ اپنے آپ کو نبی کہے یا رسول۔

اب آئیے اس آیت کی طرف جس سے یہ حضرات نبی اور رسول میں فرق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جس کی طرف ندوی صاحب نے بھی اپنے خط میں اشارہ کیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ - فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ - وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔ (۲۲/۵۲)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا کہ جب اس نے اپنی وحی کی تلاوت کی (اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا) تو شیطان نے اس کی تلاوت کردہ وحی میں اپنی طرف سے کچھ ملا نہ دیا ہو......

یعنے ہر رسول کے ساتھ یہی ہوا کہ وہ خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچا کر چلا جاتا، لیکن اس کے بعد مفاد پرست گروہ اس وحی میں اپنے خیالات کی آمیزش کر دیتے۔ لیکن خدا ایسا انتظام کرتا کہ اس کے بعد پھر ایک رسول بھیج دیتا جو سابقہ نبی کی وحی میں آمیزش کو مٹا دیتا اور خدا کی سچی اور صحیح تعلیم کو محکم طور پر لوگوں کو دے دیتا۔ یہ کچھ ہوتا رہا، تا آنکہ نبی اکرمؐ تشریف لاتے۔ اور حضورؐ کی طرف نازل شدہ وحی کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا اس لئے اب شیاطین کو اس میں کسی قسم کی آمیزش کی جرأت نہیں ہو سکتی[1]۔ اس آیت میں جو کہا گیا ہے "من رسول و لا من نبی" تو اس سے یہ حضرات یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ رسول اور نبی الگ الگ اور ایک دوسرے سے متغائر ہوتے ہیں۔

---

[1] یہ ہے اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم۔ لیکن ہمارے ہاں کے مفسرین نے جو کچھ اس سلسلہ میں کہا ہے اسکے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں سب سے پہلے آپ خود قرآن کریم کا یہ اصول ہمیشہ یاد رکھئے جس میں اس نے کہا ہے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل اور ثبوت یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ (ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً۔ (۴/۸۲)۔) یہ واضح ہے کہ قرآن کریم کی بے شمار آیات ایسی ہیں جن سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کو کتاب ملتی ہے۔ اب اگر اس آیت (۲۲/۵۲) سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا جائے کہ رسول صاحبِ کتاب ہوتا ہے اور نبی صاحبِ کتاب نہیں ہوتا، تو اس سے قرآن کی آیات میں ایک بہت بڑا اصولی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جس سے اس کے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ ہی (معاذ اللہ) باطل ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس آیت کا ایسا مفہوم صحیح نہیں ہو سکتا۔ ندوی صاحب نے جو لکھا ہے کہ بعض اہلِ علم نبی اور رسول میں فرق کے قائل نہیں، تو اُن کے سامنے یہی حقیقت ہو گی۔ لیکن جو اہلِ علم" ان دونوں میں فرق کرتے ہیں، اور اس کے لئے قرآنِ کریم کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں، اُن سے دریافت کرنا چاہیئے کہ اِس سے قرآنِ کریم کے پیش کردہ دعاوی میں جو اختلاف واقع ہوتا ہے، اسکا جواب کیا ہے؟

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ جب اس نے کسی حقیقت کو حصر کے ساتھ سامنے لانا ہو۔ (یعنی خاص اہمیت کے پیشِ نظر اس کے تمام گوشوں کا احاطہ مقصود ہو) تو وہ اس کے لئے ان مختلف الفاظ کو ایک دوسرے کے ساتھ لے آتا ہے جو اس حقیقت کے لئے قرآن کے مختلف مقامات میں آئے ہوں۔ مثلاً قرآن کریم نے اپنے آپ کو عام طور پر قرآن کہا ہے۔ لیکن کہیں کتاب کہا ہے، کہیں، ذکر کہا ہے۔ وغیرہ۔ اب قرآن ہی میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں یہ الفاظ ساتھ ساتھ بھی آتے ہیں۔ مثلاً۔ اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ (۳۶/۶۹) یا سورۃ حجر میں ہے۔ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ۔ (۱۵/۱)۔ اِن (اور ان جیسی دیگر) آیات میں اگر (وَ) کے معنی (اور) کئے جائیں تو پہلی آیت کا ترجمہ ہو گا کہ" یہ بجز اس نیست کہ ذکر ہے اور قرآنِ مبین ہے"۔ اور دوسری آیت کا ترجمہ ہو گا" یہ کتاب کی آیات ہیں اور قرآن مبین کی"۔ اس سے ذکر اور قرآن، یا کتاب اور قرآن دو الگ الگ چیزیں متصور ہوں گی۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ قرآن ہی ذکر بھی ہے اور کتاب بھی۔ ایسے مقامات میں (واؤ) تفسیری ہوتا ہے اور اس کے معنی ہوتے ہیں (یعنی)۔ اس سے ان آیات کا ترجمہ ہو گا۔" یہ ذکر ہے یعنی قرآن مبین" اور" یہ کتاب یعنی قرآن مبین کی آیات ہیں"۔ اس سے وضاحت مقصود ہوتی ہے۔

بعض اوقات اہمیت کے پیشِ نظر بھی یہی اندازِ بیان اختیار کیا جاتا ہے مثلاً سورۃ بقرہ میں ہے۔ من کان عدوا للہ وملئکتہ ورسلہ وجبرائیل ومیکائیل .... (۲/۹۸) جو اللہ اور

ملائکہ۔ اور رسل۔ اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے " یہاں پہلے ملائکہ کہا گیا ہے اور اس کے بعد جبریل اور میکائیل کا نام لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جبریل اور میکائیل، ملائکہ کے اندر شامل ہیں۔ ملائکہ کہہ دینے کے بعد ان کے الگ ذکر سے یہ مطلب نہیں کہ یہ ملائکہ سے الگ ہیں۔ مقصد صرف اہمیت کو نمایاں کرنا ہے۔ اسی طرح (۶۶/۴) میں " ملائکہ " کہنے کے بعد " وجبریل " بھی کہا گیا ہے۔

اب اسی سلسلہ میں ایک اور مثال دیکھئے۔ جس کے بعد، ہم سمجھتے ہیں کہ اس موضوع پر کچھ مزید لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ سورۃ احزاب میں ہے۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَھُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ .... (۳۳/۷)۔ پہلے کہا کہ " جب ہم نے انبیاء سے عہد لیا " ظاہر ہے کہ " انبیاء " میں تمام نبی شامل ہیں۔ اس کے بعد ہے۔ وَمِنْكَ۔ (اے مخاطب! یعنی نبی اکرمؐ) تجھ سے بھی۔ اس سے یوں نظر آئے گا گویا یہ مخاطب، زمرۂ انبیاء میں شامل نہیں، ان سے الگ کچھ اور ہے۔ اس کے بعد ہے " وَمِنْ نُّوْحٍ .... " اور نوح اور ابراہیم اور موسےٰ اور عیسےٰ سے بھی " یعنی یہ حضرات نہ تو انبیاء میں شامل ہیں اور نہ ہی اس گروہ میں جس سے مخاطب (مِنْكَ) متعلق ہے۔ پوری آیت کا ترجمہ یوں ہو گا۔

اور جب ہم نے انبیاء سے عہد لیا، اور تجھ سے بھی، اور نوح اور ابراہیم
اور موسےٰ اور عیسیٰ سے بھی ..... "

اب غور کیجئے کہ کیا اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ، حضرت نوح، ابراہیم، موسےٰ اور عیسےٰ (علیہم السلام) زمرۂ انبیاء میں شامل نہیں؛ ان سے کچھ الگ ہیں؟ لیکن ایسا سمجھنا ٹھیک نہیں۔ یہ زمرۂ انبیاء میں شامل ہیں۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ قرآن کریم کا یہ ایک خاص انداز ہے کہ وہ ایک ہی گروہ کے مختلف افراد یا ایک کل کے مختلف اجزاء کا ذکر الگ الگ بھی کرتا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ افراد اس گروہ سے یا وہ اجزاء اس کل سے الگ اور متغائر ہیں۔ لہٰذا سورۃ حج کی آیت (۲۲/۵۲) میں جو رسول اور نبی کے الفاظ الگ الگ آتے ہیں تو اس سے یہ مقصود نہیں کہ نبی اور رسول الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس سے حصر یا اہمیت کا اظہار مقصود ہے۔ اور یہ عقیدہ، کہ نبی اور رسول میں فرق ہوتا ہے ــــ رسول، صاحب کتاب ہوتا ہے اور نبی، بلا کتاب ــــ قرآن کریم کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ نبی، اور رسول ایک ہی فرد ہوتا تھا۔ اس کا خدا سے وحی پانا، نبوت تھا اور اس وحی کو آگے پہنچانا رسالت۔ چنانچہ، جب حضور نبی اکرمؐ کو خاتم النبیین کہا جاتا ہے تو اس سے مطلب یہی ہو گا کہ اب باب نبوت

بند ہو گیا۔ اس میں تشریعی اور غیر تشریعی کا کوئی فرق نہیں۔

ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ قرآنِ کریم نے "رسول" کا لفظ (کئی مقامات پر) محض اس کے لغوی معنوں میں (یعنے قاصد، یا پیغام رساں کے معنوں میں بھی) استعمال کیا ہے۔ ان لغوی معنوں میں ہر وہ شخص "خدا کا رسول" (یعنے پیغام رساں) کہلا سکتا ہے، جو خدا کے کسی پیغام کو (یعنے جو پیغام کسی نبی کی کتاب میں درج ہو، اسے) دوسروں تک پہنچائے۔ ہو سکتا ہے کہ سورۂ حج کی زیر نظر آیت (۲۲/۵۲) میں رسول کا لفظ لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہو۔ اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب کسی نبی نے اپنی کتاب کو لوگوں کے سامنے پیش کیا تو شریر النفس لوگوں نے اس میں تحریف کر دی، یا اس کی کتاب کو کسی عام انسان نے دوسروں کے سامنے پیش کیا، تو لوگوں نے اس میں تحریف کر دی۔ مقصد اس سے یہ بتانا تھا کہ قرآن سے پیشتر کتب سماوی کے ساتھ یہ کچھ ہوتا چلا آیا تھا۔

ان معانی کی رُو سے یہ بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ نبی اکرمؐ کو خاتم النبیین کیوں کہا گیا ہے، خاتم الرُّسل یا خاتم المرسلین کیوں نہیں کہا گیا ــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف کتاب کا ملنا تو اب ختم ہو گیا ہے، لیکن خدا کی طرف سے ملی ہوئی کتاب (قرآن کریم) کو دوسروں تک پہنچانے کا فریضہ جاری ہے ــــ یہ امت کی ذمہ داری ہے۔ اور جو اس فریضہ کو سرانجام دیتا ہے وہ (مصطلح معانی میں نہیں بلکہ) لغوی معانی میں خدا کا رسول ــــ یعنی اس کے پیغامات کو دوسروں تک پہنچانے والا ــــ کہلا سکتا ہے۔ (اگرچہ اس لفظ کو اب اِن معانی میں بھی استعمال نہیں کرنا چاہیئے، کیوں کہ اس سے خواہ مخواہ الجھنیں پیدا ہونے کا امکان ہے)

حاصلِ کلام یہ کہ ــــ جب قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر واضح الفاظ میں بتا دیا کہ نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں صاحبِ کتاب ہوتے تھے تو پھر سورۃ حج کی زیر نظر آیت سے یہ مفہوم اخذ کرنا، کہ نبی اور رسول میں فرق ہوتا ہے، قرآن کے بنیادی اصول اور حتمی دعوے کے خلاف ہو گا۔ لہذا یہ آیت اس قسم کی تفریق کی دلیل اور سند قرار نہیں دی جا سکتی۔ اس کا مفہوم وہی لینا لینا چاہیئے جو قرآن کے دیگر متعلقہ مقامات سے مطابقت رکھے۔

آخر میں ہم محترم ندوی صاحب (اور انہی جیسے دیگر حضرات) کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ جب آپ اپنے مسائل کی باتیں کریں تو جو کچھ آپ کے جی میں آئے کہہ دیا کریں لیکن جب قرآن مجید کے متعلق بات کرنی ہو تو اس میں بڑی احتیاط برتنی چاہیئے۔ اور جب کبھی کوئی غلطی واضح ہو جائے تو اسے کشادہ قلب سے تسلیم کر لینا چاہیئے۔

زنا کی سزا ——— رجم

طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں، ہم نے ایک مراسلہ کے جواب میں لکھا تھا کہ اسلامی مشاورتی کونسل کی سفارش، کہ جرم زنا کے ارتکاب کی سزا رجم (سنگساری) مقرر کی جائے، قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں مشاورتی کونسل کی طرف سے ایک چٹھی موصول ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کونسل نے سزائے رجم کی سفارش نہیں کی۔ اس کی سفارش کا متن حسب ذیل ہے۔

> قرآن حکیم میں زنا کی سزا سو کوڑے بیان ہوئی ہے اور احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرنِ اول میں زنا کی سزا کوڑے کی صورت میں بھی دی گئی ہے اور رجم کی صورت میں بھی۔ لہذا اسلامی مشاورتی کونسل سفارش کرتی ہے کہ سردست قرآنی سزا نافذ کر دی جائے اور اگر قرآنی تقاضائے شہادت پورا نہ ہو سکے، یعنے چار چشم دید گواہ ارتکاب جرم کی شہادت نہ دے سکیں، تو جرم ثابت ہونے پر عدالت تعزیرات پاکستان میں مذکور دوسری قسم کی سزا دے سکتی ہے۔

آپ اس سفارش کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ اس پر کس طرح عقل روتی اور دین ماتم کرتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ آئین پاکستان میں یہ درج ہے کہ ملک کا کوئی قانون "کتاب وسنت" کے خلاف نہیں ہوگا۔ آپ سوچئے کہ اگر کونسل کی سفارش منظور کر لی جائے اور اس کے مطابق قانون نافذ کر دیا جائے تو کیا وہ قانون "کتاب وسنت" کے مطابق ہوگا؟ سنت کے مطابق تو وہ اس لئے نہیں ہوگا کہ اس میں اقوال لائے سنت کی تجویز کردہ سزا (رجم) کو حذف کر دیا گیا ہے اور وہ قانون کتاب کے خلاف کیسے ہوگا؟ اس کے لئے حسب ذیل تصریحات ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) سفارش میں لکھا ہے کہ

اگر قرآنی تقاضائے شہادت پورا نہ ہو سکے۔ (لیکن اس کے باوجود) جرم ثابت ہو جائے

تو عدالت، مروجہ سزا دے دے (جو نہ قرآن کے مطابق ہے نہ سنت کے)

اس سفارش کی رو سے معلوم ہوا کہ قرآن نے جرم زنا کے اثبات کے لئے کوئی طریق شہادت تجویز کیا ہے لیکن وہ ایسا طریق ہے کہ اگر اس کے تقاضے پورے نہ بھی ہوں، تو بھی جرم ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم قانون دان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی ضابطۂ شہادت اس قسم کا ہو کہ اس کے تقاضے پورے ہو جائیں تو بھی جرم ثابت ہو جائے اور اگر وہ تقاضے پورے نہ ہوں تو بھی جرم ثابت ہو جائے تو اس ضابطۂ شہادت کے متعلق دنیا کی کیا رائے گی؟ اور جب آپ کہیں کہ یہ ضابطۂ شہادت کسی انسان کا نہیں، خود خدا کا مرتب فرمودہ ہے، تو فرمائیے، اس قسم کے خدا کے متعلق دنیا کا کیا خیال ہوگا؟

اور پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ اگر جرم، ایک طریق شہادت کی رو سے ثابت ہو تو اس کی سزا اور ہو اور دوسرے طریق شہادت سے ثابت ہو تو سزا اور! ـــ فرمائیے! کیسا رہے گا اس قسم کا ضابطۂ تعزیرات؟

(۳) اب لیجئے اس طریق شہادت کو جسے (ان حضرات کے خیال کے مطابق) خود خدا نے تجویز فرمایا ہے۔ اور وہ طریق یہ ہے کہ جرم زنا کے اثبات کے لئے ضروری ہے کہ چار گواہ شہادت دیں کہ انہوں نے اس فعل کو مرتکب ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ (ان حضرات کی تصریح کے مطابق، گواہوں نے اسے اس طرح مرتکب ہوتے دیکھا ہو جس طرح "سرمہ دانی اور سلائی" کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہ الفاظ مروجہ ضابطۂ شریعت کے ہیں)

جنسی اختلاط ایک ایسا فعل ہے جس کے ارتکاب میں انتہائی پرائیویسی برتی جاتی ہے۔ زنا تو کجا ـ میاں بیوی تک بھی اس کے ارتکاب میں اس قدر محتاط ہوتے ہیں کہ کسی کا دیکھ لینا تو ایک طرف، وہ یہ بھی نہیں چاہتے، کہ کانوں کان اس کی خبر تک بھی کسی کو ہونے پائے اور زنا میں تو اس کے ساتھ جرم کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ایسے فعل کے ارتکاب کی شہادت کے لئے چار عینی گواہوں کا مطالبہ! یا للعجب!

آپ سوچئے کہ جب یہ باتیں دنیا کے ارباب فکر و نظر کے سامنے آتی ہوں گی تو وہ اسلام اور اسکے خدا کے متعلق کیا کچھ نہ کہتے ہوں گے۔ لیکن ان حضرات کو اس سے کیا واسطہ ـــ؟

آپ کو معلوم ہے کہ یہ چار گواہوں والی بات کہاں سے چلی ہے؟ ـــ سورۃ نساء میں ایک آیت ہے

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ... (۴/۱۵)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کی مرتکب ہوں تو اپنے میں سے

چار گواہ ان کے خلاف طلب کرو۔ اگر وہ اس کی شہادت دیں تو انہیں
گھروں میں بند رکھو۔ (یعنے ان پر باہر نکلنے کی پابندی عاید کرو)

ظاہر ہے کہ یہ قانون، عام بے حیائی کی باتوں کے متعلق ہے، نہ کہ جرم زنا کے متعلق۔ ان حضرات نے پہلے تو اس آیت کا اطلاق فعل زنا پر کر دیا۔ اور اس کا مقصد صاف ظاہر ہے کہ نہ نو من تیل ہو نہ رادھا ناچے۔ نہ چار عینی گواہ ملیں، نہ جرم ثابت ہو، نہ سزا ملے۔ جب پوچھا گیا کہ جرم زنا کی سزا تو سورۃ نور میں) کوڑے بیان کی گئی ہے اور یہاں سزا صرف پابندی مسکن کی ہے، تو ارشاد ہوا کہ اس آیت (۴/۱۵) کی سزا کا حصہ، سورۃ نور کی آیت سے منسوخ ہے۔ یعنے سزا سے متعلق حصہ منسوخ ہے اور شہادت سے متعلق حصہ برقرار ہے اور سورۃ نور کی آیت، حدیث سے منسوخ ہے جس میں شادی شدہ کے زنا کی سزا رجم بیان کی گئی ہے۔ یوں جرم زنا کے اثبات کے لئے چار عینی گواہوں کی شہادت (از روئے قرآن) قرار پا گئی۔

اب مشاورتی کونسل نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ملک کے مروجہ قوانین کو کتاب و سنت کے مطابق تبدیل کرنے میں کس قدر غلطاں و پیچاں ہے، اپنی سفارش میں پہلے یہ لکھ دیا کہ مجرم کو قرآنی سزا دیجائے لیکن انہیں معلوم تھا کہ اس جرم کے اثبات کے لئے چار گواہوں کی شہادت کی جو شرط عاید کی جا رہی ہے، وہ پوری ہو ہی نہیں سکتی تو انہوں نے فرما دیا کہ ـــ

> اگر قرآنی تقاضائے شہادت پورا نہ ہو سکے اور جرم ثابت ہو جائے تو مجرم کو موجودہ تعزیرات کے مطابق سزا دیجائے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس ساری کد و کاوش کا آخری عملی نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ ـــ

> زنا کے مجرموں کو موجودہ تعزیرات کے مطابق سزا دیجائے۔

یعنی جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے اُسے بحال رکھا جائے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ اگر جو کچھ ہو رہا ہے، اسی کو برقرار رکھنا مقصود تھا تو اس کے لئے اس قدر پیچ و خم کی ضرورت کیا تھی؟ آپ کو وہ "بگلا پکڑنے والی" بات شاید معلوم نہیں۔ ایک گھاگ استاد شاگردوں کو بگلا پکڑنے کی ترکیب بتا رہا تھا کہ جب کوئی بگلا جھیل کے کنارے آ بیٹھے تو اگر وہ چھاؤں میں بیٹھا ہو تو پہلے اسے اڑا کر دھوپ میں بٹھایا جائے۔ پھر چپکے سے جا کر اس کے سر پر موم رکھ دیجائے۔ جب دھوپ سے موم پگھل کر اس کی آنکھوں میں پڑے گی تو وہ اندھا ہو جائے گا۔ بس اس وقت اسے جا کر پکڑ لیا جائے۔ شاگردوں نے کہا کہ جب اس کے سر پر موم رکھنے کے لئے جائیں تو اُسے اسی وقت کیوں نہ پکڑ لیا جائے۔ استاد نے کہا کہ واہ ـــ! اس میں استادی کیا ہوتی؟

سو اگر مشاورتی کونسل یہ کہہ دیتی کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اسی کو برقرار رکھا جائے تو اس میں "کونسلیت" کیا ہوتی؟ ——— یہ اس قدر عظیم ادارہ ——— اس کا دفتر ——— دفتر کا عملہ ——— کونسل کے بلند پایہ اراکین ——— ان پر ایک فضیلت مآب چیئرمین ——— یہ سب کیا بیکار کا مشغلہ ہے؟

اسلام کے ساتھ اتنا بڑا مذاق بھی کم ہوا ہوگا۔

ضمناً ——— اسلامی مشاورتی کونسل نے گلہ کیا ہے کہ طلوعِ اسلام نے کونسل کی سفارش کے متعلق تحقیق کئے بغیر تبصرہ کر دیا۔ اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ یہ خبر کہ کونسل نے زنا کی سزا رجم تجویز کی ہے عام اخبارات میں شائع ہوئی۔ اور بعض اخبارات نے اس پر تبصرہ بھی کیا۔ کونسل اس تمام دوران منہ میں گھنگھنیاں ڈالے خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے نہ اس خبر کی تردید کی اور نہ ہی اپنی صحیح سفارش شائع کی۔ اندریں حالات، لوگوں کو کیسے معلوم ہو کہ کونسل کی سفارش کچھ اور تھی۔ کونسل کو چاہیئے کہ یا تو اپنی سفارشات کی صحیح طور پر اشاعت کا انتظام کرے اور یا (کم از کم) اس قسم کی غلط خبروں کی تردید کر دیا کرے۔

طلوعِ اسلام کی کتابیں اور ماہنامہ طلوعِ اسلام یہاں بھی مل سکتے ہیں!

لاہور

(۱) انٹرنیشنل بک سروس ... ۷۵ دی مال
(۲) کلاسیک بک سیلرز ... ۴۲ دی مال
(۳) پیپلز پبلشنگ ہاؤس ... ۲۶ دی مال
(۴) کوآپریٹو بک شاپ ... ... ۷۰ دی مال
(۵) لاہور بک ڈپو ... ... ۶۵ دی مال
(۶) بک سنٹر ... ... چوک ریگل دی مال
(۷) ادبستان ... ... چوک لکشمی
(۸) آئیڈیل بک ہاؤس ... ۱۹۴ - انارکلی
(۹) مکتبہ پاکستان ... ... چوک انارکلی
(۱۰) گوشۂ ادب ... ... چوک انارکلی
(۱۱) مرکز ادب ... ... چوک انارکلی
(۱۲) نیشنل بک سٹال - چوک انارکلی
(۱۳) ماڈل بک سٹال بولٹن مارکیٹ دی مال

ملتان۔ دانشکدہ۔ حسین آگاہی۔

لیبیا:۔ نخل ہوٹل نزد ریلوے اسٹیشن۔ ہر جمعہ کو بعد نماز عصر۔

انگلستان:۔ محترم رشید احمد بٹ صاحب۔ ۱۶۰ سالٹ سٹریٹ۔ بریڈفورڈ ۸

کراچی:۔ (۱) محترم محمد اسلام صاحب۔ ۱۰۰۴۔ لوبین روڈ۔ نیو ٹاؤن۔ کراچی ۵
(۲) ہر اتوار کی صبح، سندھ اسمبلی ہال نزد سعید منزل بندر روڈ
(۳) مخلد انجمن کتاب گھر۔ وکٹوریہ روڈ۔ صدر۔
(۴) عوامی کتب خانہ۔ بولٹن مارکیٹ۔

لائلپور:۔ (۱) محمد احمد صاحب متعلم ایم اے گلی بلاک اے نزد پرانی غلہ منڈی۔ ریل بازار۔
(۲) شریف سنز بک سیلرز۔ کارخانہ بازار۔ لائلپور
(۳) حافظ محمد یونس صاحب۔ اے۔ ۷۰۔ گلبرگ۔ لائلپور

سرگودھا:۔ حکیم حسن محمد نظامی۔ نظامی دواخانہ۔ بلاک ۱۵۔ گلی مچھلی والی سرگودھا

وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری نہیں بلکہ نئے انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت۔ پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت۔ بارہ روپے مکمل سیٹ کی رعایتی قیمت پچاس روپے۔

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دلکش مرقع۔ قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) جیبی ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے) جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا نہایت سادہ اور دلکش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔

جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین، مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت: بارہ روپے

نظام ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

برق طور — صاحب ضرب کلیمؑ اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان، جو یوں کہیئے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت عیسیٰؑ کی بصیرت افروز داستانِ حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

سلسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام
ضحی الاسلام
} مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکۃ آراء تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔
(فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

الفتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

Regd. L. No. 7243
MONTHLY TOLU-E-ISLAM LAHORE

عربی خود سیکھئے

طلوع اسلام کی کوششوں کی بدولت قوم کے نوجوان طبقہ کے دل میں قرآن کریم کی طرف رجوع ہونے کا شوق پیدا ہوا تو یہ تقاضا بھی سامنے آیا کہ قرآن مجید کو خود سمجھنا چاہیے ۔ اس کے لیے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے ۔ ادارہ طلوع اسلام کی مدت سے خواہش تھی کہ ایک ایسی مختصر اور سلیس سی کتاب شائع کی جائے جس سے اردو جاننے والے حضرات تھوڑی سی محنت سے اتنی عربی سیکھ جائیں جس سے قرآن مجید بآسانی سمجھ میں آ جائے ۔ للہ الحمد کہ وہ کتاب اب شائع ہوگئی ہے ۔ اس کا نام ہے ۔

عربی خود سیکھئے

عام اشاعت کی غرض سے اسے چیپ ایڈیشن میں شائع کیا گیا ہے ۔ قیمت فی جلد صرف اڑھائی روپے ۔ جلد منگا لیجئے ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵/بی ۔ گلبرگ ، لاہور